قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ —— لاہور

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱
پوسٹ کوڈ —— ۵۴۶۶۰
ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری
معاون : ثریا عندلیب
ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاءُ الرحمٰن آرائیں
طابع : خالد منصور نسیم
مطبع : النُّور پرنٹرز و پبلشرز
۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵
ٹیلیفون —— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۴ —— مارچ ۱۹۹۱ء —— شمارہ ۳

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان —— ۶۰ روپے
بیرونی ممالک —— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے
فی پرچہ : ۵/- روپے

فہرست مضامین

۱ لمعات —— (ادارہ) —— ۳
۲ خلیجی بحران —— (غلام رسول ازہر) —— ۶
۳ سیاسی پارٹیاں —— (ملک حنیف وجدانی) —— ۱۲
۴ پیٹ کی آگ —— (عبداللہ ثانی) —— ۲۱
۵ وہ ماحول کہاں —— (محمد اسلم رانا) —— ۲۶
۶ تباہ کُن جرائم —— (ادارہ) —— ۲۹
۷ اصولِ حیات —— (ادارہ) —— ۳۱
۸ خلیجی دیپک راگ —— (غلام رسول ازہر) —— ۳۲
۹ اسلامی شریعت کے بنیادی اصول —— (ادارہ) —— ۳۴
۱۰ نظامِ حکومت کا قرآنی تصوّر —— (ادارہ) —— ۳۶
۱۱ مکافاتِ عمل —— (ادارہ) —— ۳۸
۱۲ آخرت (قرآن بچوں کیلئے) —— (قاسم نوری) —— ۴۱
۱۳ روزہ کے احکام —— علامہ غلام احمد پرویز —— ۴۶
۱۴ اجتماعی زندگی —— ادارہ —— ۵۱
۱۵ حج کا مقصد —— علامہ غلام احمد پرویز —— ۵۳
۱۶ کرنے کا کام —— ادارہ —— ۵۹
۱۷ تجارب —— ۶۰

قرآن کریم کی جامعیّت

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے :

" بحر اطلانتک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلّق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں :

" اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرّہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا ــــــ ان سب کیلئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔"

تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۰

لمعات

بحوالہ جشنِ جمہوریہ

وقت کی پکار

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

زندگی اور بقا اس کے لئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع رساں ہو۔ دنیا میں وہی نظام، وہی مملکت، وہی قوم زندہ رہ سکے اور آگے بڑھ سکے گی جو ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہو گی جس میں نوعِ انسانی کے لئے بیش از بیش سامانِ بہبود و منفعت ہوگا۔ کائنات کی طبعی زندگی میں بقاء للاصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا قانون جاری ہے لیکن انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں "اصلح" وہی ہے جو "انفع" ہے۔ یعنی جو نوعِ انسانی کے لئے زیادہ سے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس اصول کے دو حصے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس نظام کو نفع رساں ہونا چاہیئے۔ جو نظام نقصان رساں ہے وہ بھی باقی نہیں رہ سکتا، اور جو نہ نقصان پہنچاتا ہے نہ فائدہ، بقا اس کے نصیب میں بھی نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو نظام، زندگی کی منفی اقدار (NEGATIVE VALUES) رکھتا ہے (اسے نقصان رساں کہتے ہیں) وہ باقی نہیں رہتا۔ بلکہ جو جامد ہے، بقا اس کے حصے میں بھی نہیں۔ بقا اور استحکام صرف اس نظام کے لئے ہے جو زندگی کی مثبت اقدار (POSITIVE VAULES) کا مظہر اور نفع رسانیوں کا حامل ہے۔ دوسرا گوشہ اس اصول کا یہ ہے کہ اس نظام کی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، خاص جماعت یا خاص پارٹی یا خاص قوم تک محدود نہ ہوں بلکہ وہ تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوں۔ اس کی منفعت عالمگیر اور حدود فراموش ہو۔ اگر کسی نظام کی منفعت کوشیاں کسی خاص طبقہ یا پارٹی تک ہی محدود ہو کر رہ جائیں، تو بھی اسے بقا اور استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔

ایک طرف تو یہ نظام ہے۔ دوسری طرف وہ نظام ہے جسے قرآن "بخل" کا نظام کہہ کر پکارتا ہے۔ بخل کے معنی ہیں سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر رکھ لینا۔ اس نظام میں برسرِ اقتدار گروہ رزق کے سرچشموں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر ان کے ماحصل کو سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ اس نظام کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں، نظامِ سرمایہ داری کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس نظام کے مظہر بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار اور بڑے بڑے کارخانہ دار اور سوداگر ہیں۔ یہ طبقہ تعداد کے لحاظ سے ملک کی آبادی کا قلیل ترین حصہ ہے لیکن مملکت کی ساری دولت انہی کے قبضہ میں ہے۔ باقی آبادی ان کے رحم و کرم پر جیتی ہے۔ انہی میں سے کچھ لوگ آگے بڑھ کر حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہو جاتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ ایسے قوانین مرتب کرتے رہیں جن سے اس سرمایہ دار طبقہ کے مفاد محفوظ رہیں۔ یہ ہے وہ نظام جس کے متعلق قرآن کا فیصلہ ہے کہ انہیں وقت کے لئے پیش پا افتادہ مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن انہیں استحکام اور بقا کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے:

وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (۴۷/۳۸)

جو مفاد پرست نظام یا گروہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ تو وہ اگرچہ بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے لئے سب کچھ حاصل کر لیا ہے لیکن وہ درحقیقت اپنے آپ کو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر رہا ہے۔ وہ انہیں جھنجوڑ کر کہتا ہے کہ

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (۴۷/۳۸)

اگر تم نے ہمارے اس قانون سے (کہ باقی وہی رہے گا جو نوعِ انسانی کے لئے زیادہ منفعت بخش ہوگا) روگردانی کی تو سن رکھو کہ خدا کا قانونِ استخلاف واستبدال تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

اب اس قانون کی روشنی میں پاکستان کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ یہاں "مَا یَنْفَعُ النَّاس" کا نظام کارفرما نہیں بلکہ "مترفین" کا نظام بحل مسلط ہے۔ ملک میں معدودے چند لوگوں کا ایک گروہ ہے جو رزق کے تمام سرچشموں پر قابض ہے کچھ لوگ ان میں سے زمینوں پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں۔ کچھ کارخانوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ کچھ تجارت کے نقاب میں کالی منڈیوں (BLACK MARKETS) کے اجارہ دار ہیں۔ کچھ جائیدادوں کے مالک ہیں۔ انہی میں سے کچھ آگے بڑھ کر اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر وزارت کی کرسیاں سنبھال لیتے ہیں جسے ہم وزارتوں کے ٹوٹنے اور بننے یا جدید انتخاب کے ذریعے تبدیلی کہتے ہیں وہ دراصل اس گروہ کے بعض افراد کا دوسرے افراد سے بدلنا ہوتا ہے۔ یعنی اس تبدیلی سے ہوتا صرف اتنا ہے کہ اس گروہ کے کچھ افراد پیچھے چلے جاتے ہیں اور ان کی جگہ (اس گروہ میں سے) نئے افراد آگے آجاتے ہیں۔ اقتدار بدستور اس طبقہ کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

گذشتہ چوالیس سال سے پاکستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور قرآن کے اس ابدی اصول کے مطابق جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ معاشرے میں زندگی اور توانائی کے آثار دن بدن کم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور قوم جہنم کی تباہیوں کی طرف کشاں کشاں بڑھے چلی جا رہی ہے۔ قوم خود بڑھے نہیں جا رہی بلکہ اسے ہنکا کر جہنم کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴/۲۸)۔ کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی نعمت سے نوازا تھا لیکن انھوں نے اس کی ناسپاس گزاری کی اور اپنے کاروانِ ملت کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کاسد کا کوئی خریدار ہی نہیں۔ جَھَنَّمَ (۱۴/۲۹)۔ یعنی وہ انہیں جہنم میں لے گئے۔ قوم کے سادہ لوح جمہور ہر نئی وزارت کی تشکیل اور ہر نئی اسمبلی کی ترتیب کے ساتھ اپنی نئی نئی امیدیں باندھتے اور اس طرح اپنے آپ کو فریب دیتے رہے لیکن انکی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ مفاد پرست گروہ نے بھی انھیں اسی فریب میں مبتلا رکھا کہ نقص افراد کا ہے۔ افراد کے بدلنے سے حالات سدھر جائیں گے اور اس طرح عوام کی توجہ کو اس طرف آنے ہی نہیں دیا کہ نقص افراد کا نہیں بلکہ اس نظام کا ہے جس کے نمائندے یہ افراد ہیں۔ لہٰذا جب تک یہ غلط (غیر قرآنی) نظام نہیں بدلتا، اصلاحِ حال کی کوئی صورت پیدا ہو نہیں سکتی۔ غلط نظام سے خوشگوار نتائج کی توقع رکھنا، فطرت کے خلاف جنگ ہے جس میں آج تک نہ کسی قوم کو کامیابی ہوسکی ہے نہ ہو سکے گی۔

اسلام تو نہ کسی سرمایہ دار کی دولت سے کچھ واسطہ ہے نہ ان اربابِ شریعت کے غلط مذہب سے کچھ سروکار ... سے تو ایک ہی مقصد ہے کہ یہ خطۂ زمین جو ہمیں نصیب ہوگیا ہے کسی طرح باقی رہ جائے تاکہ اس میں کبھی قرآن کے ... تقاضے کے مطابق معاشرہ قائم ہو سکے۔ چونکہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ

مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (۱۳/۱۷)

بقا اسی کے حصہ میں آئے گی جو نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہوگا، اس لئے وہ علیٰ وجہ البصیرت دیکھتا ہے کہ جو ... یہاں نظامِ سرمایہ داری کے استحکام کی کوشش کر رہے ہیں، وہ پاکستان کے بہی خواہ نہیں ہیں، لہٰذا وہ ان کی مخالفت کرتا ہے۔ ان میں زمیندار، جاگیردار، کارخانہ دار، تجار اور ان کے پشتیبان، غلط مذہب کے علمبردار اور اربابِ اقتدار سب شامل ہیں۔

ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ غور سے دیکھیں کہ ہم نے حالات کا جو تجزیہ کیا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔ اگر وہ ہم سے متفق ہیں کہ وہی یہاں کا اصل مرض ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور وہی اس کا علاج ہے جو ہم نے قرآن کی روشنی میں تجویز کیا ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ وہ ان نازک حالات میں جن سے ہم گزر رہے ہیں اپنا کیا فریضہ سمجھتے ہیں؟ یاد رکھئے، پاکستان کسی خاص گروہ اور خاص طبقے کی ملکیت نہیں۔ یہ ہم سب کا مسکن و مامن اور ہماری آنے والی نسلوں کا گہوارہ ہے اور ان تمام حسین آرزوؤں کا محور، جو ہم نے اس سے وابستہ کی ہوئی ہیں۔ اس لئے اس کا تحفظ اور استحکام ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ لہٰذا ہم میں سے جنہیں اس ذمہ داری کا احساس ہے ان کے ذمے بہت بڑا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ انہیں ہر قدم پر اس کا محاسبہ کرنا چاہیئے کہ وہ کس حد تک اس فریضہ کی ادائیگی سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ آئین ساز اسمبلی کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اسلامی شریعت نافذ کرنے سے پہلے ملک میں رائج نظامِ معیشت کو، قرآنی نظامِ ربوبیت کے خطوط پر استوار کرے اور اس طرح ان تمام تخریبی قوتوں کو عملاً شکست دیدے جو یہاں نظامِ سرمایہ داری کے تحفظ و استحکام کی کوشش کر رہی ہیں اور اس طرح پاکستان کو تباہی کے جہنم کی طرف لے جا رہی ہیں۔ اگر آپ کی کوششوں سے اس میں کامیابی ہوگئی تو اس سے یہاں اتنا بڑا خوشگوار انقلاب پیدا ہو جائے گا جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں مل سکے گی۔ واشرقت الارض بنور ربھا اور یہی پاکستان کے حصول کا مقصد تھا اور یہی جشنِ جمہور کا صحیح مفہوم ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر یہ سب کچھ محض رسم پرستی اور خود فریبی ہے۔

غلام رسول ازہر

خلیجی بُحران، عالمِ اسلام کے تناظر میں

خلیجی بُحران کے سیاق و سباق میں اغیار کی سازش سے عالمِ اسلام میں اتنا بڑا المیہ اتنے بڑے منظّم انداز میں عالمی سطح پر اس قدر کھُلے بندوں شاید پہلی مرتبہ رونما ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں اپنی اپنی مصلحتوں کی بنا پر عالمِ اسلام نہ صرف بے دردی سے بٹ گیا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہے، بلکہ مبیّنہ حق و ناحق کی آڑ میں اس سے بصد عجلت و اضطراب، نادانستہ قرآن مجید کے احکامِ صریحہ (المائدہ ۵۱ اور الحجرات ۹-۱۰) کے خلاف ایک ایسا غیر اسلامی اور غیر دانشمندانہ مہلک ترین اقدام بھی سرزد ہو گیا ہے جس کی پیش رفت میں وہ اپنی ہی مقدس ترین سرزمین میں اپنے ہی دشمن نصرانیوں اور یہود نواز نصرانیوں کو بطور محافظ بُلا کر اور اپنے ہی مصارف پر ان کو بطور اجرتی قاتل جملہ سامانِ ہلاکت بہم پہنچا کر اپنی موت آپ مر رہا ہے۔ نیز اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کا بطور قوّت نافذہ عالمی سطح پر عالمِ اسلام کے خلاف اس سے بڑا تباہ کُن مسلّح مظاہرہ بھی چشمِ عالم نے شاید کم کم دیکھا ہو گا کہ اعدائے اسلام بہ کمالِ سرعت و یکجہتی، چھاتی تان کر، کندھے سے کندھا ملا کر، کیل کانٹے سے پوری طرح لیس ہو کر عالمِ اسلام کی آسمان جاہ سرزمینِ پیغمبراں میں عالمِ اسلام ہی کے ایما اور فیاضانہ حق الخدمت پر اس کو جلد سے جلد نیست و نابود کرنے پر دل و جان سے تُلے ہوئے ہوں اور اس تاریخی مواقع کو صلیبی جنگوں کا بدلہ چکانے کے لئے اپنی انتہائی بدبختی جان کر اپنے آزمودہ اور
1 نو آزمودہ جدید ترین مہلک ہتھیاروں، بحری بیڑوں اور لاتعداد بمبار طیاروں سے شب و روز بلا وقفہ اندھا دُھند زمین و آسمان سے آگ برسا کر، ہنستی بولتی ہوئی بے گناہ آبادیوں کو چشم زدن میں بھسم کرا انتہائی بے رحمی سفّاکی اور ہلاکت آفرینی کا قیامت خیز مظاہرہ کر رہے ہوں۔

یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ مگر ہم بطور امّتِ مسلمہ اپنی اپنی مصلحتوں کے خول میں بند عملی طور پر ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں۔ حالانکہ بطور امّتِ مسلمہ عالمِ اسلام کا سب سے پہلا فرض تو یہ تھا کہ وہ

…حیدی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مابین معاملات کو سلجھانے کیلئے اسلامی یو۔این۔او کی بجائے اقوامِ متحدّہ کا ایک فعّال اور با اختیار ادارہ معرضِ وجود میں لاتا تاکہ جب کبھی کوئی تنازعہ اسلامی ریاستوں کے درمیان سر اٹھاتا تو اسے **مِلّتِ اسلامیہ** کے نمائندہ ادارے کی حیثیت سے اسلامی قوانینِ عدل و انصاف کی رُو سے نپٹا دیتا۔ مگر ہم نے دنیا میں ایک بھرپور قوّت ہوتے ہوئے اور ہم جہت وسائل سے مالا مال ہوتے ہوئے بھی ایسا کوئی منظّم اقدام نہ کیا، جو بطور قوّتِ نافذہ عمل پذیر ہوتا اور ہمیں ہمارے اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے با اختیار کر کے ہمیں غیر مسلم اقوام کا محتاج اور دریوزہ گر نہ بناتا۔ یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم نے بطور امّتِ مسلمہ اپنے نجی معاملات کو سلجھانے کے لئے بھی خود کو ادارہ اقوامِ متحدہ کے سپرد کر دیا ہے جہاں پر فیصلے عدل و انصاف کی بجائے سُپر طاقتوں کی انا اور مرضی کے تابع ہیں اور جس کا مقصدِ وحید صرف یہی ہے کہ اس کے ذریعے سربرآوردہ اقوام کی دنیا میں بالادستی قائم رہ سکے۔

مفکّرِ ملّت حضرت علاّمہ اقبالؒ نے سابقہ جمعیّتِ اقوامِ عالم (لیگ آف نیشنز) کی ہیئت و ساخت اور دائرہ کار کا فکری تجزیہ کر کے اپنی اصابتِ رائے کا بہت عرصہ پہلے یوں اظہار کیا تھا:۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

اسلامی نقطۂ نظر سے یہی تجزیہ اب بھی ادارہ اقوامِ متحدّہ (یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن) پر چسپاں کیا جا سکتا ہے کہ اگر فلسطین کی نئی ریاست "اسرائیل"، جو عالمِ عرب کے قلب میں چھُرا گھونپنے کے مترادف تھی، تخلیق کرنا مقصود ہو تو عالمِ اسلام کی شدید مخالفت کے باوجود اسے عالمِ وجود میں لایا جائے اور اسی طرح اگر پاکستان کے منصفانہ موقف کے پیشِ نظر اور ادارہ اقوامِ متحدہ کے ریزولیوشن کے باوجود کشمیر میں استصواب کرا دیا جائے، اگر سُپر طاقتیں مخالف ہوں تو ادارہ مذکورہ معاملے کو محض کاغذی کاروائی تک لٹکائے رکھتا ہے اور اگر اسی ادارہ میں کسی سُپر پاور کا کوئی ذاتی مفاد مقصود ہو تو پھر انصاف کے نام پر ویٹ نام اور خلیج کے منطقوں میں راتوں رات فیصلے کر کے علی الصّبح قیامتِ صغریٰ کا سماں پیدا کر دیا جاتا ہے۔

یہ امرِ واقعہ ہے کہ امریکہ، کویت اور سعودی عرب کا کوئی مخلص دوست یا ہمدرد نہیں اور اس ضمن میں جارح عراق اور مجروح کویت کے مابین اسے بحالیٔ انصاف سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی دلچسپی تو اس کے اس خطّہ سے وابستہ ذاتی مفادات ہیں۔ یہ بات بین السّطور پڑھی جا سکتی ہے کہ موجودہ بحران سے قبل خود امریکہ کی نظریں کویت اور مشرقِ وسطیٰ کے تیل کے ذخائر کی طرف تھیں اور وہ حیلہ بہانہ سے کویت پر اپنا تسلّط جمانا چاہتا تھا کہ عراق کو امریکہ کے اس غلط اندیش مجرمانہ منصوبے اور امریکہ کی بدنیتی کی بروقت خبر ہو گئی تو

اس نے بقصد عجلت پیش قدمی کر کے امریکی منصوبہ کو خاک میں ملا کر اور امریکہ کو پہل کرنے کا موقع دینے سے قبل ہی کویت پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اب امریکہ کو کویت سے حُبِّ علی نہیں بلکہ عراق سے بغضِ معاویہ ہے۔ کہ عراق اس کے اِس سوچے سمجھے منصوبے میں حارج ہوا اور پھر عالمِ اسلام کی بدقسمتی سے خود امریکہ کو کویت اور سعودی عرب کی طرف سے اسلام کی تعلیمات کے علی الرغم اشارہ مِلا اور لُوں اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں، پس وہ بھاگم بھاگ عالمِ عرب میں عربوں کا سب سے بڑا حمائتی اور اتحادی بن کر مبیّنہ حارج کیخلاف امداد کے بہانے آدھمکا:

دلوار پھاندنے میں دیکھوگے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا حضرت سلام میرا

اب امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں اور ان کے تو مزے ہی مزے ہیں کہ جنگ کا میدان سرزمینِ عرب ہے۔ جنگ کے جملہ مالی اخراجات کویت اور سعودی عرب برداشت کر رہے ہیں۔ جب کہ امریکہ کے پیشِ نظر اپنی اور اسرائیل کی بالادستی قائم کرنے کا اسرائیلی منصوبہ ہے جس کی تکمیل کا خواب از خود شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے اور جس میں اب اسرائیل کو ہاتھ ہلانے تک کی ضرورت نہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ عربوں کے بے پناہ تیل کے ذخائر از خود ہاتھ لگ رہے ہیں اور اب گویا آسٹریلیا اور دیگر عیسائی ممالک اور یہود نواز ممالک سب کے سب اپنے اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس تناظر میں عراق کی سرکوبی محض کارِ خیر نہیں بلکہ عالمِ اسلام میں ان کے اپنے اور اسرائیل کے ایک بڑے دشمن کی سرکوبی ہے جو جوہری توانائی اور ٹیکنالوجی کی برتری کی گستاخی کا حامل ہے۔ اب اس کے بعد خاکم بدہن پاکستان ایسے صِندی اور ہٹیلے کی باری ہے کہ امریکہ، ہندوستان اور اسرائیل، پاکستان کو بھی جوہری توانائی کے حصول میں اپنی راہ کا بھاری پتھر سمجھتے ہیں۔ ایسے میں ہم سب مسلم ممالک پر بُرا وقت آ گیا ہے اور ہم پر فی الفور بطور مسلم امّہ یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم عراق کی تباہی پر اصولی موقّف کی رٹ لگانے کی بجائے معاملہ کی تہہ تک پہنچیں اور یہ سمجھیں کہ مخصوص حالات کی رُو کے مطابق آیا کویت پر عراقی قبضہ کمتر برائی تھا یا موجودہ امریکی قبضہ اور پھر اس سیاق و سباق میں اگر عراق جارح بھی ہے تو اس کا معاملہ قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں مسلم اُمّہ کے طے کرنے کا ہے نہ کہ ادارہ اقوام متحدہ کے حل کرنے کا۔

اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ گو عراق جارح ہے مگر یہ جارح مسلمان ہے، کافر نہیں جسے سورہ الحجرات میں قرآنی احکام کے مطابق عالمِ اسلام کی قوتِ نافذہ کی بدولت راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے کہ بالآخر معاملہ مسلم امّہ کے ذریعے عدل و انصاف کی رُو سے فریقین میں صلح پر منتج ہو مگر یہ نہیں کہ عراق کو

جارح جان کر امریکے کے مذبح میں بھیج دیا جائے جہاں امریکہ اس پر عالمِ اسلام کو فنا کرنے کیلئے بے پناہ ستم ڈھائے اور اسے نیست و نابود کرنے پر تُل جائے اور یہ محض قیاس نہیں بلکہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ شب و روز عراق کی شہری آبادیاں آتش و آہن کی لپیٹ میں ہیں اور ان پر لحہ بہ لحہ لاکھوں ٹن بارود برسایا جا رہا ہے۔ بے گناہ انسان۔ عورتیں۔ بوڑھے بچے اور بیمار بلا امتیاز لحظہ بہ لحظہ موت کا شکار ہو رہے ہیں۔ قیامتِ صغریٰ برپا ہے، لاشے تڑپ رہے ہیں، دستِ دعا شل ہو گیا ہے، زمیں سے گرم لاوا پھٹ رہا ہے۔ مکان اور مکین روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ ایسے میں بطور مسلمان ہمیں قرآن کریم کی نصِ صریح "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ" نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ مومن جسدِ واحد کی مانند ہے۔ جب کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم درد سے بلبلا اٹھتا ہے۔ بقول اقبالؒ :

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

پس امتِ واحدہ اگر جسدِ واحد ہے تو بالآخر عراق بھی اسی جسدِ واحد کا حصہ ہے اور یوں عراق دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں اس قدر قابلِ مذمت شدید ترین ظالمانہ سزا کا کسی صورت میں بھی مستحق نہیں ہے۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں **کافر** نہیں ہوں میں

پس گناہگار مسلمان اور کافر کا یہی وہ فرق ہے جو ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جو جارح مسلمانوں کو بھی بطور گناہگار مسلمان کافروں سے متمیز کرتی ہے اور مسلم امّہ سے ان کے بارے میں قرآنی تعلیمات اور اسلامی قوانینِ عدل و انصاف کے تحت منصفانہ طرزِ عمل کا تقاضا کرتی ہے اور یوں گناہگار مسلمان کو کافروں کے مذبح میں بھیجنے کی بجائے اس سے قرآن کریم کے مطابق صلح جوئی کا مطالبہ کرتی ہے مگر یہ جبر کافرانہ جبر نہیں بلکہ صلح جویانہ منصفانہ عدل ہے کہ پایانِ کار مقصود بالذات اس کی تباہی و بربادی نہیں بلکہ رجوع الی اللہ ہے تاکہ معاملہ کو عدل و انصاف کے تقاضوں کے ساتھ صلح جوئی سے نپٹایا جا سکے۔ جیسا کہ سورہ الحجرات کی آیت ۹، ۱۰ سے ظاہر ہے۔

ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ

" تم ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کرو "

صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟!

آپؐ نے فرمایا:

"ظالم کو ظلم سے روکنا ہی اس کی مدد ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اسلام ظالم کو ظلم سے روک کر معاشرہ کو خیر کی دعوت دیتا ہے۔ مگر ظالم کو نیست ونابود کرنا اپنا النصب العین قرار نہیں دیتا۔ یہ تو ایک انسانی، فلاحی، عمومی قاعدہ کلیہ ہے جو کافر و مومن دونوں پر محیط ہے مگر جہاں مسلمانوں کی دو جماعتوں میں باہمی لڑائی شروع ہو جائے وہاں پر تو سورہ الحجرات میں بطور نص صریح ارشادِ ربانی ہے کہ اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو باقی مسلمانوں پر بطور مسلم امۃ یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ متحارب فریقوں میں فی الفور صلح کرا دینی چاہیئے اور پھر بھی اگر ایک فریق دوسرے فریق پر زیادتی کرے تو مسلم امۃ مظلوم فریق کا ساتھ دے اور زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف صف آراء ہو جائے اور یوں ظالم کو ظلم سے روک دے کہ یہی اس کی مدد ہے اور یہ لڑائی جہاد کے حکم میں شامل ہے کہ اس لڑائی کا نیک مقصد یہ ہے کہ زیادتی کرنے والا فریق اپنی زیادتی سے باز آجائے اور اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے اور پھر جونہی یہ باغی فریق اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے تو اس کے خلاف طاقت کا استعمال روک دیا جائے کہ غایتِ اولیٰ صلح جوئی اور عدل و انصاف پر مبنی امن و آشتی ہے۔ ہلاکت آفرینی اور نیست و نابود کرنا نہیں کہ ایسا کرنا تو انسانیت کے خلاف ناقابلِ عفو جرم اور قتلِ عام سے عبارت ہے۔ جو منشائے الٰہی سے متصادم ہے۔

بخاری و مسلم کتب احادیث کی بعض روایات سے بھی یہ امر واضح ہے کہ مدینہ منورہ میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی جب انصار کے دو گروہوں اوس اور خزرج میں باہمی لڑائی ہو گئی تو آپؐ نے ان کے مابین صلح کرا دی اور وہ دوبارہ بھائی بھائی بن گئے کہ اسلام کی تعلیمات کی اساس اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" کی عملی صورت اخوّت و مواخات ہے اور باہمی لڑائی میں بھی جذبۂ اخوّت، صلح جوئی اور عدل و انصاف کو ہمہ وقت پیشِ نظر رکھنا ہے۔ جیسا کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کے بارے میں رکھتا ہے اور یہ کہ اگر ایسی افسوس ناک صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ اسلام میں کسی باغی گروہ کے خلاف، اسے راہِ راست پر لانے کے لئے طاقت کا استعمال بھی ناگزیر ہو جائے تو وہاں بھی اخوّت کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے اور اس سے کسی طور پر بھی ویسا سلوک نہ کیا جائے جیسا کہ غیر مسلموں سے کیا جاتا ہے بلکہ اسے ایمان کے دائرے میں رہ کر اپنا بھائی سمجھو اور انتقامی جذبے کو غالب نہ آنے دو اور ہمہ قسم کی زیادتی اور اشتعال انگیزی سے بچو کہ مقصود اصلاح احوال ہے اس کی بربادی نہیں۔ ــــــــــ

باہمی لڑائی کے باوجود رشتۂ اخوت

...ختم نہیں ہوتا اور مسلمان بدستور بھائی بھائی رہتے ہیں اور دورانِ جنگ اور بعد از جنگ بے جواز اشتعال انگیز بہیمانہ سلوک کے مرتکب نہیں ہوتے کہ خانہ جنگی میں بھی اسلام کا تعزیراتی قانون انسانی فلاح و بہبود پر مبنی ہے۔ ذاتی رنجش کینہ۔ شقاوتِ قلبی، بے رحمی، ظلم و استبداد و استہلاک اور قتلِ عام پر منتج نہیں اور ویسے بھی مسلمان باغیوں سے وہ سلوک نہیں کیا جاتا جو غیر مسلم باغیوں سے کیا جاتا ہے کہ باغی مسلمانوں اور مسلمانوں کے مابین باہمی رشتۂ اخوت و مودت معاندانہ رویّہ کے مانع ہے اور امن و سلامتی کا ضامن ہے۔ ایران جس کے خلاف عراق نے پورے نو سال بے جواز خونریز جنگ لڑی، ہم سے کہیں زیادہ اس نکتہ سے واقف ہے اور باوجود عراق کی ظلم و زیادتی اور چیرہ دستیوں کے امّتِ مسلمہ کے مفاد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نہ صرف اسے مطعون نہیں کر رہا ہے بلکہ امریکہ اور اس کے حواریوں کے انسانیت سوز ظلم و ستم کے خلاف آوازۂ حق بھی بلند کر رہا ہے اور خانہ برباد ستم رسیدہ عراقی پناہ گزینوں کے لئے اپنی سرحد بھی کھولے ہوئے ہے اور مصیبت زدہ عراقی ہوا بازوں کو جلتے ہوئے ہوائی جہازوں کے ساتھ اپنی سرحد پر اترنے کی اجازت بھی دے رہا ہے کہ بالآخر عراق امّتِ مسلمہ کا فرد ہے۔ جب کہ بعض دیگر مسلم ممالک اس نکتہ کو بہت حد تک بھول رہے ہیں اور عراق کو ہمہ وقت جارح، جارح کا طعنہ دے کر اور اس کی اگلی پچھلی کوتاہیاں گنوا گنوا کر اس کے خلاف انسانیت کُش وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک کی بے جواز تائید کر کے امریکہ اسرائیل برطانیہ فرانس، اطالیہ، آسٹریلیا، اور دیگر غیر مسلم اتحادی اقوام کے مزید ظلم و ستم کو ہوا دے رہے ہیں اور جلد سے جلد عراق کے نیست و نابود نہ ہونے پر بے حد متاسف اور امریکہ اور اس کے جملہ حواریوں کی تباہی کی کارکردگی سے غیر مطمئن اور اس کے اب تک بے نتیجہ اور فیصلہ کن نہ ہونے پر ملول و غمزدہ ہیں اور ان سے زبانِ حال سے ھَلْ مِنْ مَّزِیْد کا تقاضا کر کے بیگانوں کی طرح عالمِ اسلام کی تباہی کا تماشا دیکھ رہے ہیں:

تو کُنی جور بر دلِ خسرو
من چوں بیگانگاں تماشا کُنم

ملک حنیف وجدانی

سیاسی پارٹیاں

سیاسی پارٹیوں کے وجود کو خلافِ قرآن قرار دینے کے لئے راولپنڈی سے جناب عبدالرزاق صاحب کی درخواست وفاقی شرعی عدالت میں ابھی تک زیرِ سماعت ہے۔ طلوعِ اسلام نے اپنی اکتوبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں جناب عادل صاحب کے ۲۱ سوالات جو انہوں نے وفاقی شرعی عدالت کے سامنے پیش کئے تھے، شائع کرتے ہوئے قارئینِ طلوعِ اسلام کو دعوتِ فکر دی تھی، جس کے جواب میں مری سے ملک حنیف وجدانی صاحب سے جوابات موصول ہوئے ہیں، جو دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے شاملِ اشاعت ہیں

یاد رکھئے!

وحدتِ اُمّت اور اس کے بعد وحدتِ انسانیت کا مدار وحدتِ قانون پر ہے اور قانونی وحدت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہو جو تمام نوعِ انسان کیلئے ضابطۂ حیات ہے!!

سوال:۔ سنّت اور اُسوہ میں کیا فرق ہے اور یہ کہ کیا قرآن کریم میں سنّت کا لفظ اللہ تعالےٰ کی ذاتِ اقدس و اعلیٰ کے سوائے کسی اور ذات کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ نیز کیا سنّت کا لفظ اللہ تعالےٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور کے لئے استعمال کرنا اعجاز قرآن کے خلاف بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کیساتھ برابری پیدا کرنا نہیں ہے ؟

جواب:۔ ہم پہلے اُسْوَۃٌ کا لفظ لیتے ہیں۔

اس کا مادہ ا س ی ہے۔ اَسْیَانٌ۔ اَسْوَان۔ اَلْاَسِیُّ۔ اَسِیَۃٌ۔ اَسَاہُ۔ اَلْاُسُوُّ۔ اِسْوَۃٌ۔ اُسْوَۃٌ وغیرہ الفاظ آتے ہیں۔ اس کے معانی میں غمگین ہوا۔ طبیب۔ معالج۔ غم کرنے والی عورت۔ مصیبت میں تسلی دینا۔ زخم کی دوا کرنا۔ اس طرح ایسے لوگوں کی دادرسی کر کے قابلِ تقلید مثال چھوڑنا اُسْوَۃٌ بنتا ہے۔ جب اس کے ساتھ حَسَنَۃٌ کا لفظ ملے، تو ایسی منفرد مثالیت کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کی نظیر نہ مل سکے۔ مثلاً حضورؐ کا اُسوہ حسنہ۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (۳۳/۲۱)۔

اور قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ (۶۰/۴) یہ خدائے واحد پر ایمان لاکر قوم اور باپ کی دشمنی مول لینے کا اسوہ حسنۂ ابراہیمی تھا۔

اب ہم لفظ "سنّت" کی طرف آتے ہیں اور پھر دونوں کے فرق کا بھی جائزہ لیں گے۔

اس کا مادہ "س ن ن" ہے۔ سِنّ کا لفظ اسی سے بنا ہے۔ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ۔ (۵/۴۵)۔ دانت کے بدلے دانت۔ پھر عُمر کا تعین اس سے ہونا ثابت ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِکُمْ سُنَنٌ (۳/۱۳۷)۔

وَ یَھْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (۴/۲۶)۔

یہاں سنن سے مراد راہیں یا طریقے ہیں۔ جو انسانوں نے اختیار کئے ہیں۔ اب ہم اس مادہ سے بننے والے لفظ سنّت کی طرف آتے ہیں۔

سُنَّۃٌ۔ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ۔

۱۔ قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَھُوْا یُغْفَرْ لَھُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ج وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ (۸/۳۸)۔

کافروں سے کہو کہ اگر تم باز آجاؤ تو تمہارے سابقہ غلط اعمال کے نتائج سے تمہاری حفاظت کردی جائے گی۔ لیکن اگر تم بدستور تعدّی کرتے رہے تو یہ وہی سنّت (طریقہ) ہے جو مجرم اقوام

پہلے کرتی رہی ہیں۔

۲۔ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۲—۱۳/۱۵)۔

جب مجرمین کے قلب مُردہ ہو جائیں اور اس کے مطابق ان کا کرتا دھرتا رہ جائے اور وہ عملاً ایمان نہ لائیں، تو یہ طریقہ کوئی نیا نہیں، یہ پہلوں کا طریقہ ہے۔ یعنی انکار سنّت المجرمین ہے جو شروع سے آج تک یوں ہی ہوتا آیا ہے۔

۳۔ وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَ يَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا (۱۸/۵۵)۔

جب لوگوں کے پاس ہدایت آجائے تو ایمان سے ان کو نہیں روکا جاتا وہ رب سے حفاظت طلب کریں یا پہلوں کے طریقہ پر چل کر مجرمانہ تعدی کریں یا ان پر عذاب آجائے۔

یہ ہیں سنت الاوّلین کی ہی مثالیں۔ اب ہم اس لفظ کے "سُنَّةَ اللّٰه" سُنَّةِ اللّٰه کے الفاظ کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲)۔

۲۔ نِ اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵/۴۳)

۳۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۴۰/۸۵)۔

۴۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۴۸/۲۳)۔

اقوامِ عالم میں ہر ایک قوم کے پاس رسول آیا (ختم نبوت سے پہلے) لیکن انہوں نے ہر رسول کو

۔۔ر مُعلّم ۔ رجل مسحور ۔ شاعر ۔ مجنون ۔ اللہ پر افترای کرنے والا وغیرہ کہہ کر تجبر ، مکر ، استہزا
در ڈانٹ ڈپٹ سے اس دعوت کو ناقابلِ اعتنا جانا اور مخالفت کی ۔ یہ سنّت الاوّلین ہے لیکن
اس پر مہلت کا کچھ وقفہ دیا جاتا تھا ۔ پھر مجرم قوم کی سخت گرفت ہوتی تھی ۔ اس طریق کار
کو سنّت اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی یعنی کوئی قوم بے عملی کے
باوجود خدا کی پیاری نہیں کہ اس کو چھوڑ دیا جائے گا ۔ مکافاتِ عمل اٹل ہے ۔ اس مکافاتِ عمل
میں کوئی تبدیلی ، کوئی تحویل نہیں ہو سکتی ۔

اللہ کے لئے سنّت کے لفظ کا یہ استعمال اعجاز قرآن کا درجہ رکھتا ہے ۔ اس باب میں
سنّت اللہ کا کوئی ہمسر نہیں ۔ اوّلین اور آخرین سب کے لئے سنّت اللہ کا یکساں اطلاق ہوتا ہے
اور آئندہ بھی ہوگا ۔

(مجرم قوم) انسانوں کے لئے سنّت کا لفظ ان کے باغیانہ ارادہ و اختیار کی وجہ سے
استعمال ہوا ہے اور اللہ کے لئے ان اختیارات ، یعنی تخلیق در تخلیق کی تنوع درجہ بندی پر
قادرِ مطلق ہونے کا درجہ کمال ہے جن پر " سنّت اللہ " جاری ہو وہ تو ان سب کو ختم بھی کر سکتا ہے
اور ان کی جگہ دوسری مخلوق لا سکتا ہے ۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ (۳۵/۱۶) ۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ وَ یَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ (۴/۱۳۳)

ہم جن کے لئے " سنّت الاوّلین " کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ ان سب کو ختم کر کے نئی مخلوق
۔۔نے کی سنّت پر بھی قدرت رکھتا ہے ۔ لہٰذا انسانوں کے لئے یہ لفظ عارضی اور اللہ کے لئے دوامی و
۔۔بدی ہے ۔

بہرحال جب تک یہ انسانی نوع کرۂ ارض پر باقی ہے ۔ اس کو " سنّت اللہ " پر بہت غور و فکر کرنا چاہیئے
تاکہ وہ اپنی محدود زندگی میں عذابِ الٰہی سے محفوظ رہ سکے ۔

اسوۃ اور سنّت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسوہ مخلوق کا ہے ۔ " سنّت اللہ " اس سے
بہت بلند و بالا ہے ۔ اسوۃ تغیر پذیر ہو سکتا ہے جب کہ سنّت غیر متبدل ہے ۔

اب ایک اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے " سنّت رسول اللہ " لیکن جب ہم قرآن کریم
سے اس کا جواب چاہتے ہیں تو صورتِ حال یوں بنتی ہے ۔

۱ ۔ اگر مجرم اقوام کی ایک جیسی روش کو " سنّت الاوّلین " کہا جا سکتا ہے تو ایسی صورت حال

کے بالکل برعکس حضرات انبیائے کرامؑ کی ایک جیسی دعوت، ایک جیسا مخالفانہ انداز اور اس پر استقامت کیوں سنت نہیں کہلا سکتا یا ہم اس کو "سنت الانبیاء" کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

۲. اگر انبیائے کرامؑ کی دعوت کے طریقِ کار کو سنت الانبیاءؑ کہا جائے تو اس سنت کے کون کون سے گوشے قرآن میں واضح طور پر موجود ہیں۔

۳. ان نکات کا تانا بانا ملاتے ہوئے ہم قرآن کریم سے ان مقدس ہستیوں کے اعمال و افعال پر مشتمل "سنت الانبیاءؑ" کا ایک خاکہ مرتب کرنے کی ناتمام کوشش کا آغاز کرتے ہیں قرآن کریم میں ہے۔

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (۴۱/۴۳)

اب اس قرآنی صداقت کو ہم تلاش کرتے ہیں کہ "سنت اللہ" کیا ہے۔ (اور یہ بات اپنی جگہ برقرار رہے گی کہ متن قرآن میں سنت رسول، سنت نبی یا سنت الانبیاء کے الفاظ کہیں نہیں آئے)

۱. تبلیغِ رسالت بلامعاوضہ۔

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۶/۱۰۹)

حضرت ہود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ..... (۲۶/۱۴۵)۔

حضرت لوط علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ..... (۲۶/۱۶۴)۔

حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ..... (۲۶/۱۸۰)۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ..... (۴۲/۲۳، ۳۹/)۔

یہ ہے سنت الانبیاء علیہم السلام کا ایک اہم ترین نکتہ! پھر آج سنتِ رسول کے احیاء کے سلسلہ میں اجر و ثواب کی جو خرید و فروخت جاری ہے۔ اس پر بھی ایک نگاہ ڈالئے!

اگر آج سے ہمارے حضرات علماء و مشائخ تبلیغ دین بلامعاوضہ جاری کردیں تو کتنا بڑا انقلاب آجائے۔ ؎ یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است!

ب۔ اتباعِ وحی سنت الانبیاء ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں۔

وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ (۱۱/۳۶) فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ (۲۳/۲۷)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں۔

وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَ اَخِیْهِ (۱۰/۸۷)۔

وَ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ (۱۷/۲)۔

اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی (۲۰/۴۸)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان

وَ اِبْرٰهِیْمَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْکِتٰبَ (۵۷/۲۶)۔

اور حضور نبی اکرم کی طرف۔

وَ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۳۳/۲، ۱۰/۱۰۹، ۶/۱۰۷، ۴۳/۴۳)

یہ ہے سنت الانبیاء کہ وحی کا اتباع کیا جائے۔ کاش حکمران یہ سنت اپنائیں۔

ج۔ ہجرت سنت الانبیاء ہے اور یوں آباء و اجداد کی میراث و اموال سے استفادہ نہ کرنا بھی سنت الانبیاء ہے۔

وَ هَمَّتْ کُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ لِیَاْخُذُوْهُ (۴۰/۵)۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی تو وہ ہجرت کر گئے۔

فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ (۳/۹۵)

حضرت نوح علیہ السلام کی ہجرت۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ (۷/۶۴، ۱۰/۷۳)۔

حضرت لوط علیہ السلام کی ہجرت۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ کَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ (۷/۸۳)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ

بَغْيًا وَّ عَدْوًا ط حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ (۱۰/۹۰)۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی ہجرت ۔

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا (۱۱/۹۴)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت ۔

وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ (۱۹/۴۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہجرت ۔

۱۔ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (۴/۱۵۸)۔

۲۔ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ .... (۳/۵۵)۔

مثال

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۵۸/۱۱)۔

رفیع الدرجات کے نقطۂ نظر سے حیاتِ ارضی میں کامیابیاں جو ہجرت کے بعد ہوئیں اور پھر حضور نبی اکرمؐ کی ہجرت ۔

وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴/۱۰۰)۔

وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ (۴/۱۰۰، ۸/۷۲، ۳/۱۰۳)

ہجرت کرنے والے اپنا سب کچھ چھوڑ کر چلے جاتے تھے ۔ نہ آباء و اجداد کی میراث نہ اموال بلکہ رشتہ دار بھی ایمان کے رشتہ والے رہ جاتے تھے باقی جانی دشمن بن جاتے تھے ۔

اگر ہجرت کو سنّت الانبیاءؑ قرار دیا جائے اور مسلمانوں کے رہبر بننے کا دعویٰ کرنے والے اس سنّت الانبیاءؑ پر عمل کریں تو یہ جاگیرداریاں اور سرمایہ داریاں باقی نہیں رہ سکتیں ۔

د ۔ سنّت الانبیاء میں مشاورت کا درجہ ۔

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ کا تذکرہ موجود ہے ۔ (۸/۶۶، ۲۰/۴۷، ۲۹-۳۰، ۸۹/۲۹، ۱۱/۵۸، ۱۱/۶۶، ۱۱/۹۴، ۷/۶۴) اور تمام انبیاء کرامؑ ان سے مشورہ کرتے رہے ۔ یہی حال حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی بیان کیا گیا ہے مثلاً

وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸، ۹/۲۲)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا (۳/۲۰۰)

ان حالات میں امت سے مشاورت ہر دور کا خاصہ رہا ہے اور اس سنّت الانبیاء کو زندہ کرنا حقیقی زندگی ہے۔ اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد مشاورت کو ترک کر کے آمرانہ، ملوکانہ اور متوارث ترجیحات کو اہمیت دینا اس سنّت الانبیاءؑ کے بالکل خلاف ہے۔

۸۔ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ۔

خدا نے زمین و آسمان کو بنایا۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۴۲/۱۱)۔

لہٰذا، یہ زمین اس کی ہے۔ یہاں اسی کی مرضی اور قانون چلے گا۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳۷/۸۷)۔

وہی یہاں کے سامان نشوونما کے لحاظ سے ارض والوں کا رب ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲)

اگر یہاں دو الٰہ ہوتے تو فساد بپا ہو جاتا۔

وَ الْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰)۔

زمین کی وضع و تشکیل جانداروں کے لئے ہے۔

سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰)۔

ہر چاہنے والے کے لئے اس میں برابر کے حقوق ہیں۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تمام اقوام کی طرف آئے۔ کوئی گلہ بان تھی۔ کوئی تاجر تھی۔ جب انسانی معیشت زراعت پر استوار ہوئی تو یہ دور غالباً حضرت صالح علیہ السلام کے وقت سے ترقی کرنے لگا۔ اور زمین کو اللہ کی زمین کہا گیا۔ یہ سنّت الانبیاء کی پہلی رانٹ تھی۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْ اَرْضِ اللّٰهِ (۷/۷۳)۔

اللہ کی اونٹنی اللہ کی زمین میں۔ یوں اللہ کا بندہ بھی اللہ کی زمین میں یکساں حقوق والا بن گیا۔

ہم یہاں ترجمان قرآن جناب حضرت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے تصورات بھی پیش کئے دیتے ہیں جو زمین کے اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

(۱) "اے کہ می گوئی متاعِ ماز ماست | مرد ناداں ایں ہمہ مُلکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو | چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوا
کس امانت را بکارِ خود بَرَد | اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپُرد
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ | تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ
زیرِ گردُوں فقر و مسکینی چراست | آنچہ از مولاست، می گوئی زماست"

(کلیاتِ اقبال (فارسی) ص۶۹۷)

(۲) حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت | ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر | رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ اَلْاَرْضُ لِلّٰہ ظاہر است | ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

(کلیاتِ اقبال (فارسی) ص۶۶۱)

گویا حضرت علامہ نے زمین کی انفرادی ملکیت کو فساد اور کافری کے الفاظ سے تعبیر کرکے ایک اہم حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ جس سے ہمارے علماء و مشائخ ناواقف ہیں یا اس بات کو ظاہر کرکے جاگیرداروں کی مخالفت سے ڈرتے ہیں۔

اس تمام تفصیل سے یہ حقیقت ظاہر ہوگئی کہ اگر کوئی سنّت الانبیاء کے احیاء کا داعی ہے تو اُسے

۱۔ تبیغِ دین بلا معاوضہ کرنی چاہیئے۔

۲۔ اتباعِ وحی (قرآن) کی طرف دعوت دینی چاہیئے۔

۳۔ ھجرت لہٰذا، آباء و اجداد کی وراثت سے کم از کم استفادہ کرنا چاہیئے ۔

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا بردن آوردن لعل کہ در سنگ است

۴۔ اُمّت میں مشاورت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے جو صرف اکثریت کی نمائندگی نہ کرے۔ بلکہ ایک ایک کے حق کی نمائندگی کرے۔

۵۔ زمین کو " الارض اللہ" کا درجہ دینے کی طرف بدستور قانون سازی کی جائے۔ اس سلسلے میں صدر مرحوم ضیاء الحق نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس کی رپورٹ حکومت کے پاس موجود ہے۔ یہ بہت اچھی رپورٹ ہے۔ اس پر عمل درآمد کیا جائے۔

عبداللہ ثانی

پیٹ کی آگ

کائنات کی کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کے ساتھ پیٹ نہ لگا ہو۔ پیٹ کی شکل مختلف ہوسکتی ہے۔ لیکن پیٹ ضرور ہوگا۔ ان میں سب سے بڑا پیٹ حضرتِ انسان ہی کا ہے۔ شیر بھی پیٹ رکھتا ہے اور بھینس بھی۔ اول الذکر بھوک سے مر جائے گا لیکن گھاس کبھی نہیں کھائے گا۔ بھینس کے سامنے گوشت کا ڈھیر لگا دیں، ہفتوں بھوکی رہے گی لیکن گوشت کو منہ نہیں لگائے گی۔ مگر انسان ہے کہ اپنے پیٹ میں سب کچھ ڈال کر بھی کہتا ہے:

ھل من مزید ——— لاؤ اور بھی لاؤ........

اور یہی وہ مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے یہ آج تک سرگرداں ہے۔ کمیونزم میں اپنی روٹی (پیٹ) کے مسئلہ کا حل تلاش کرتا ہے تو کبھی جاگیرداری نظام میں، کبھی سرمایہ داری میں سرگرداں نظر آتا ہے تو کبھی صنعتکاری میں۔ یہ نزدیک نہیں آیا تو قرآنی نظام کے جو ضمانت دیتا ہے اس کی اور اس کی اولاد کی پرورش کی۔

ایک عرصہ تک کمیونزم (اشتراکیت) یا جدید اصطلاح میں سوشلزم نے پوری دنیا کو بے وقوف بنائے رکھا۔ گھڑا پھوٹا تو اندر سے ایسا خالی نکلا کہ اس میں کچھ تھا ہی نہیں۔ وہی نظام جس کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بجتا تھا، آج نانِ شبینہ کا محتاج ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ کمیونزم کو عوام النّاس نے علیٰ وجہ البصیرت قبول نہیں کیا تھا، اسے بزورِ شمشیر منوایا گیا تھا۔ اس لئے اس کا ناکام ہو جانا یقینی تھا۔ ——— اس کے مقابلہ میں قرآن اپنا نظامِ ربوبیّت دلیل و برہان کی رُو سے پیش کرتا ہے اور دعوتِ فکر دیتا ہے کہ اسے پرکھ کر دیکھو، مفید پاؤ تو اختیار کر لو۔

سوشلزم اپنے انجام کو پہنچا۔ وہ ادیب، شعراء، محقق، مفکر، مصنفین اور علماء جو سوشلزم کو انسانیّت کی فوز و فلاح کا ضامن خیال کرتے تھے۔ اب بغلیں جھانک رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس لئے کہ:

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ——— (۱۳/۱۷)

"باقی وہ رہتا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو"

یعنی کرۂ ارض پر وہی نظام برقرار۔ قائم و دائم رہیگا جو بنی نوعِ انسان سے منفعت کی بات کرے گا۔ جو نظام بھی چند ہاتھوں میں ہوگا اور چند افراد کے مفادات کا تحفظ کرے گا وہ نظام نہ تو قائم رہ سکتا ہے اور نہ ہی آگے چل سکتا ہے۔ محولہ آیت پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں کسی مخصوص طبقے کی بات نہیں کی گئی۔ مخصوص تو کیا مذہبی وابستگی تک کا ذکر نہیں کیا گیا کہ خداوند لم یزل کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کوئی مسلمان ہے یا یہودی۔ نصرانی ہے یا ہندو۔ قرآن کریم بات شروع کرتا ہے تو ربوبیّت عالمین کی اور بات ختم کرتا ہے تو بھی بنی نوعِ انسان کے نشوونما دینے والے کی حیثیت سے۔ قرآن کریم روٹی کے مسئلہ کا جو حل پیش کرتا ہے وہ ہماری سمجھ میں آ تو سکتا ہے لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمیں آج تک تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بھوکا رکھتا ہے۔ حالانکہ قانونِ خداوندی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ (۱۷ : ۳۰)

"(اور اکتسابِ رزق کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرو۔ اس لئے کہ) تمہارے نشوونما دینے والے کا قانون یہ ہے کہ جو چاہتا ہے کہ اسے کھلا رزق ملے، اسے کھلا رزق ملتا ہے اور جو نپا تُلا لینا چاہے اسے نپا تُلا ملتا ہے، وہ ہر ایک کی سعی و عمل سے باخبر ہے اور ہر ایک کی طلب و جستجو پر نگاہ رکھتا ہے۔"

ویقدر: اس نے پیمانے بنا رکھے ہیں۔ ان پیمانوں پر جو بھی پورا اترے گا رزق اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ جو ان پیمانوں کو استعمال نہیں کرے گا، وہ مسکین۔ محتاج اور طلبگار رہیگا۔ اس کے بنائے ہوئے قوانین اٹل اور مستقل ہیں۔ وہ اپنے قوانین کبھی نہیں بدلتا۔ یہ اس کا قانون ہے کہ مرد و زن کے اتّصال سے انسانی پیکر ہی پیدا ہوگا۔ یہ اس کی سنّت ہے کہ پانی نیچے کی طرف بہے گا۔ اسی طرح یہ بھی اسی کا قانون ہے کہ :

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (۵۵/۱۰-۱۲)

اس میزانِ عدل کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انسانی پرورش کیلئے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ یعنی زمینی پیداوار، مثلاً لذیذ پھل، خوشوں کے پردوں میں لپٹی ہوئی کھجوریں۔ بالوں کے اندر اناج۔ رنگا رنگ خوشبودار پھول۔ انہیں ہم نے ہر فرد کیلئے الگ الگ نہیں رکھا۔ اسے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے مشترکہ طور پر دیا ہے۔ اس کی تقسیم کیلئے قرآن کی میزان دے دی گئی ہے۔ تاکہ ہر فرد کو اس کی ضروریات کے مطابق رزق ملتا رہے (اگر مشترکہ سامانِ زیست کی تقسیم اور صرف کیلئے خداؐ کی طرف سے مستقل اصول و قوانین نہ دیئے جاتے

سے لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہ جس طرح چاہیں اسے صرف میں لائیں، تو طاقتور انسان سب کچھ سمیٹ کر بیٹھ جاتے اور کمزور انسانوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے کچھ نہ ملتا۔ جیسا کہ ان قوانین کو نظر انداز کر دینے سے دنیا میں ہو رہا ہے۔) یہ ہے خدا کا نظامِ ربوبیّت جس کی رُو سے اس نے تمام نوعِ انسان کے لئے سامانِ زیست بھی دیا اور اس کی تقسیم کیلئے راہنمائی بھی۔

جہاں تک تقسیمِ رزق کا سوال ہے اسے یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے واضح کر دیا کہ:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَط (۲/۲۱۹)

"اے رسول! یہ لوگ تم سے سوال کرتے ہیں کہ انہیں واضح طور پر یہ بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں ان کا اپنا حق کس قدر ہے اور دوسروں کا کس قدر؟ ان سے کہہ دو کہ اس میں تمہارا حق صرف اتنا ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔"

حتّٰی کہ اگر ایسا موقعہ آجائے کہ دوسروں کی ضروریات تمہاری ضروریات سے زیادہ اہم ہیں تو تم اپنی ضروریات پر ان کی ضرورت کو ترجیح دو۔ (۹ / ۵۹)

سرمایہ داروں کی طرف سے یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ اگر سب کی ضرورت فوری طور پر پوری کر دی جائے یا بالفاظِ دیگر معاشرے میں مساویانہ انداز اختیار کیا جائے تو اونچ نیچ سے تہی داماں زندگی ایک قبرستان بن کر رہ جائے گی۔ کاش وہ جانتے کہ جنّت تو نام ہی اس مقام کا ہے جہاں امن و سکون اور ہر چیز کی فراوانی ہو گی اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا استحصال نہیں کر سکے گا۔ کاش وہ یہ بھی جان لیتے کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۱۰ : ۴۱)۔ تمام نوعِ انسان کیلئے خدا کی طرف سے عطیہ ہے وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۲۰ : ۱۷) اور جو چیز تمام انسانوں کو بطور عطیہ ملی ہو اس پر پھاٹک لگا کر "میری اور تیری" کی حد بندیاں قائم کرنے کا کس کو حق ہے؟ رزق کے ان سرچشموں کو آبِ رواں کی طرح بہتے رہنا چاہیئے۔ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ٥ (۷ : ۱۰۷) کچھ لوگ رزق کے آبِ رواں کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم میں انفرادی خیر۔ خیرات اور صدقات کی تاکید کی گئی ہے جس کا تعلق انسانی ذات کی نشوونما سے ہے۔ انفرادی نشوونما ہو گی تو اس کے اثرات اجتماعی نشوونما پر بھی منتج ہونگے۔ لیکن قرآن شروع ہی سے اجتماعی نشوونما پر زور دیتا ہے۔ مومنین سے وہ کہتا ہے کہ انفرادی مفاد پرستی کے جذبات جنہیں شیطانی وساوس کہا جاتا ہے، تمہیں ورغلائیں گے کہ پیسہ اپنے پاس رکھو وقت پر تمہارے کام آئے گا (۲ / ۲۶۸) لیکن تم اس فریب میں نہ آجانا۔

معاشرہ میں ناہمواریوں سے جو فساد رونما ہوتا ہے۔ اس میں انفرادی ملکیتیں کچھ کام نہیں آیا کرتیں، ایسا سمجھنے والے اور دوسروں کو بھی اسی قسم کی پٹی پڑھانے والے تباہیوں اور ہلاکتوں کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھاتے ہیں (۴/۳۷، ۲۴) یاد رکھو! جو کچھ تم اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے دو گے اس سے تمہاری حفاظت ہی نہیں ہو گی بلکہ مزید نشوونما ہوتی جائے گی۔

ہمارے ہاں جب بھی کوئی وعظ کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو اس کا پہلا جملہ یہ ہوتا ہے کہ "لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ کائنات کی ہر شے کا مالک خدا ہے۔

درحقیقت مالکِ ہر شے خدا است

ایں امانت چند روزہ نزدِ ما است

اس قسم کے اشعار بڑے محلّات کی پیشانیوں پر لکھے جاتے ہیں کہ ہم خود فریبی کے ہی نہیں خدا فریبی کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ پوری دنیا میں کسی سرکاری یا غیر سرکاری رجسٹر میں خدا کے نام نہ تو ایک مرلہ زمین ملی ہے نہ کسی بینک میں خدا کے نام پر ایک روپے کا ڈیپازٹ ہے۔ اس وقت پوری قوم اکتنازِ زر میں مصروف ہے۔ حالانکہ دولت کے معنی گردش کرنے کے ہیں اور یہ اسی صورت میں اپنا مقصد پورا کر سکتی ہے جب یہ گردش میں ہو۔ انفرادی ہوسِ زر پرستی جب اسے گردش میں رہنے کی بجائے، جمع کر کے رکھ لیتی ہے تو اس کا اثر معاشرے پر بھی پڑتا ہے۔ اکتنازِ زر انفرادی ہو یا اجتماعی، حکومتی سطح پر ہو یا نجی سطح پر۔ اس کا اثر فوری طور پر مرتب ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے دولت کے اکتناز کو سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ اس سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں جن میں یہ دولت اور اس کے جمع کرنے والے دونوں بری طرح جھلسنے اور جلتے ہیں، (۹/۳۴-۳۵) ——— یہ شعلے ان کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں (۱۰۴/۲۰۷) ——— یہ اس آگ سے لاکھ بچنا چاہیں لیکن وہ انہیں آوازیں دے دے کر بلاتی ہے اور آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح ان کا سب کچھ تباہ کر دیتی ہے (۷۰/۱۸-۱۵)۔

اس کے علاوہ سرمایہ پر بڑھوتی کو ربٰو کہا گیا ہے، جسے حرام قرار دے دیا گیا ہے اور خدا اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ محنت کا اصول یہ بتایا کہ:

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)

"معاوضہ صرف محنت کا ہے"

سورۃ واقعہ کی آیات ۶۳ تا ۶۴ میں کتنے واضح انداز میں کہا گیا ہے:

تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو، تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون

کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ایسا ہوتا ہے۔"

اس کے بعد کہا:

پھر کھیتی کے اگنے کے بعد، اس کی حفاظت کون کرتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اُگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر رہ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم کیسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف ہماری محنت اور بیج بھی بیکار گئے

پھر کہا:

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے؟

آگے فرمایا:

ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) ویسے کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کر لیتے حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملے پر اس نہج سے غور کر کے صحیح نتیجے پر کیوں نہیں پہنچتے اور نشوونما کے متعلق خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے۔

اس طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے اس سے اتنے کام لیتے ہو۔ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا جس میں شعلے کو نہاں کر دینا تمہاری کاریگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے۔

رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر؟ تم کسی نہج سے بھی غور کرو اسی نتیجے پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے لہٰذا اس کے ماحصل (سامانِ زیست) میں بھی تمہارا حصہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے۔ تمام ذرائع پیداوار از خود موجود رہتے ہیں یہ نہ تمہارے بنائے ہوتے ہیں، نہ خریدے ہوتے۔"

یہ تمام کے تمام ذرائع رزق تمہیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ خدا نے انہیں بھوکوں کیلئے سامانِ زندگی بنایا ہے۔ یہ ہے قرآنی نظام کی وہ روشنی جس سے نہ صرف انسان کے پیٹ کی آگ بجھ جاتی ہے، بلکہ اسی دنیا میں اسے جنّت بداماں زندگی میسّر آجاتی ہے۔

محمد اسلم رانا ۔(ڈنمارک)

قصاص اور دیت
وہ ماحول کہاں ہے؟

یاد رکھو! جس اصول کے مطابق مستبد قوم سے اجتماعی طور پر جنگ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ (یعنی حقوقِ انسانیت کے تحفظ کی خاطر) اسی اصول پر اپنے معاشرے میں انفرادی طور پر جرم کی سزا دینی بھی ضروری قرار پاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کسی کی جان محفوظ نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا اس بات میں قانون یہ مقرر کیا جاتا ہے کہ قاتل کو معاشرہ کی طرف سے سزا ضرور دی جائے (اسے خود معاشرہ یا نظام کے خلاف جرم سمجھا جائے) سزا کے سلسلہ میں عدل و مساوات کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے یعنی اس میں بڑے اور چھوٹے میں کوئی تمیز نہیں ہو گی۔ سوال قاتل یا مقتول کی حیثیت کا نہیں۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے جس کی رُو سے ہر انسانی جان یکساں قیمت رکھتی ہے۔ مثلاً اگر قاتل آزاد مرد ہے تو وہی آزاد مرد سزا پائیگا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو سزا ملے گی۔ اگر وہ عورت ہے تو اسے عورت ہونا سزا سے نہیں بچا سکیگا۔

جرم قتل کی دو صورتیں ہیں۔ قتل بالارادہ (قتل عمد) اور قتل سہواً۔ اوّل الذکر کی صورت میں سزائے موت ہے لیکن اگر قتل عمد نہیں کیا گیا یعنی سہواً قتل ہو گیا ہے تو اس کی سزا دیت ہے۔ اس صورت میں مجرم کیلئے ضروری ہے کہ پابندی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے (قتل سہواً کی سزا مقرر کرنے میں) تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے قانون میں رعایت رکھ دی گئی ہے تاکہ اس سے تم سب کی صلاحیتیں مناسب نشو و نما پاتی رہیں۔ لیکن جو شخص اس طرح معاملہ طے ہونے کے بعد زیادتی کرے تو اسے سخت سزا دی جائے۔ (سورہ بقرہ ۱۷۸ آیت)

اگر تم سطحی جذبات سے ہٹ کر عقل و فکر کی رُو سے غور کرو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قصاص کے اس قانون میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے اس سے تم لاقانونیت کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے۔ (البقرہ آیت ۱۷۹)

قصاص اور دیت کے لئے یہ ہے قانون جو اس اسلامی مملکت میں نافذ ہوتا ہے جہاں پر کتاب اللہ

کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یعنی جہاں قرآن کو عملاً بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ جزوی اطلاق نہیں۔!!!

اسلامی مملکت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو (۶/۱۱) اسلامی حکومت جو خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے۔ خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔ اس لئے وہ افرادِ مملکت سے اعلانیہ کہتی ہے کہ ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی (۶/۱۵۱) وہ ان میں سے ہر فرد کو اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ ہم ایسا جنتی معاشرہ متشکل کریں گے جس میں تمہیں بھوک کی پریشانی ہوگی نہ لباس کی، نہ پیاس کی تکلیف ہوگی نہ سردی گرمی سے بچنے کی۔ اس میں روٹی کپڑا مکان وغیرہ تمام افراد کو میسر ہوگا اس کی ذمہ داری ہمارے سر پر ہوگی۔

اس قسم کے اسلامی (جنتی) معاشرے میں قتل عمد کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گو کہ جنتی معاشرہ میں قتل سہوًا بھی بعید از قیاس ہے تاہم اس کی گنجائش کو ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں اس وقت ایک ارب مسلمان آباد ہیں ان کی اپنی آزاد مملکتیں بھی ہیں لیکن کہیں بھی کتاب اللہ کی حکمرانی نہیں ہے۔ لہٰذا وہاں افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا فرد خود ذمہ دار ہے۔ لیکن مسلمان ہونے کی جہت سے کتاب اللہ کے مطابق سزا کا مستحق ضرور قرار دیا جاتا ہے۔ قطع ید اور درّے تو وطنِ عزیز کے نام سے تاریخ کے اوراق میں سطور ہو چکے ہوئے ہیں۔

پچھلے دنوں وطنِ عزیز میں ۱۷۰۰۰۰۰ روپے اور دس سال کی قید کی صورت میں قصاص اور دیت کی جھلک ہی سے امریکے ڈرائیور طبقہ لرزہ براندام ہو گیا۔ اسی کے رعشہ کے تحت اس طبقہ نے احتجاجاً ہڑتال کردی۔ قصاص اور دیت کے قانون کو واپس لیتے ہوئے حکومت نے اسے نظرِ ثانی کیلئے نظریاتی کونسل کے سپرد کر دیا۔

نظریاتی کونسل سے قصاص اور دیت کا آرڈیننس نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ منظر پر آیا اہمیت تو اس کی جوں کی توں ہی رہی صرف رقم کی ادائیگی کا مسئلہ **عاقلہ** کی ذمہ داری قرار دے دیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ماحول کا جائزہ کوئی نہیں لیتا۔ جب ماحول ہی سازگار نہیں حادثات تو ہوتے ہی رہیں گے ان سے کیسے بچا جا سکتا ہے

وطنِ عزیز میں شاہراہ ایک ہی ہے بلکہ اکلوتی ہے جس کے کنارے منڈی ہے اور گاؤں بھی آباد ہے مال مویشی جہاں جی چاہتا ہے گھومتے پھرتے ہیں۔ گدھا گاڑی ہے، بیل گاڑی، تانگہ، ٹریکٹر معہ ٹرالی، مال بردار ٹرک، بسیں، کاریں، سائیکلیں، کتے، بھیڑیں، بچے سب ہی ایک اکلوتی سڑک کو استعمال کرنے پر تلے رہتے ہیں یا مجبور ہیں۔ جہاں تک قصاص کا تعلق ہے دنیا کے ہر ملک میں اس کیلئے سخت ترین سزا موجود ہے لیکن پاکستان میں اس پر کوئی خاطر خواہ کنٹرول نہیں ہے۔ دیہی اور قبائلی آبادی میں معمولی چپقلش پر قتل کر دینا معمولی واقعات ہیں۔ ان تمام کی روک تھام کیلئے ماحول کا سازگار ہونا انتہائی ضروری ہے۔ جس میں معاشی اور معاشرتی تحفظ

مغربی یورپ کی اقوام نے قرآن کے معاشرتی اور معاشی نظام کو اپنے ہاں کمال مہارت سے رائج کر رکھا ہے۔ انسان تو ایک طرف حیوانات، جانور اور چرند پرند کی تمام ضروریات معقول ماحول میں پوری کی جاتی ہیں۔ ان پر کسی قسم کا ناروا سلوک مالک کو عدالت میں پہنچا دیتا ہے۔ یہاں پر بے ساختہ حضرت عمر فاروق اعظم رض کا وہ اعلان یاد آتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ اگر دریا کے کنارے ایک کتا بھی رات بھر بھوکا رہا تو اس کا مؤاخذہ عمر سے ہوگا۔ کتنا بڑا اعلان ہے۔

○ اسلامی مملکت کا سربراہ اپنی ضروریات کو سب سے مؤخر رکھتا ہے وہ اس وقت کھاتا ہے جب سب کھا چکتے ہیں۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنادے اور وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپروائی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپروائی برتے گا۔ (ابوداؤد۔ کتاب الخراج)

○ جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہوگیا۔ (مسند امام احمد)

○ مملکت کا فرض ہے کہ وہ کسی فرد کو محسوس تک نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔ (ترمذی۔ باب الفرائض)

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں وفات پا جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے ذمہ ہوگی۔ حضورؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں سو ان میں سے جو مقروض وفات پا جائے تو اس کے قرضہ کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔ (ابوعبید۔ کتاب الاموال)

مقروض کا قرض بھی مملکت ادا کرے گی اور اگر وہ اپنے اہل و عیال کو بے سہارا چھوڑ جائیگا۔ ان کی ذمہ داری بھی مملکت کے سر پر ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت ہے:

○ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص کچھ چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کیلئے ہے لیکن جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری میرے سر پر ہوگی۔ (ترمذی۔ باب الفرائض)

جس مملکت میں تعلیم کی شرح ۲۶ فیصد ہو وہاں یہ سمجھانا کہ اللہ اور اس کے رسول سے درحقیقت مراد مرکزی اتھارٹی ہے رسول اللہؐ نے خدا کو انسانوں سے رب العالمین اور رب العالمین سے متعارف کرایا اور اس کی کتاب کو ذکر العالمین اور رب العالمین نے رسولؐ کو اپنی کتاب میں رحمۃ العالمین کے خطاب سے نوازا۔ مشکل کام ہے ——— اب خدا سامنے آتا نہیں رسولؐ ہم میں موجود نہیں۔ لہٰذا جہاں پر کتاب اللہ کی حکمرانی ہوگی۔ وہی ہوگی اسلامی مملکت جو خدا اور اس کے رسولؐ کی ذمہ داری سے عہدہ براہ ہوگی۔

بشکریہ ۔ جنگ ۔ (لندن)

تباہ کُن جرائم کی فہرست

۱۔ جب کسی معاشرہ میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں، عزت کا معیار دولت قرار پا جائے اور محنت اور دستکاری سے روٹی کمانے والوں کو ذلّت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے جیساکہ قومِ نوحؑ کے ساتھ ہُوا۔

۲۔ جب قومیّت کا معیار، ایمان یا نظریۂ حیات کے اشتراک کی بجائے رنگ، نسل، وطن کا اشتراک قرار پا جائے تو اس کا نتیجہ بھی تباہی ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے سامنے آتی ہے۔

۳۔ جو قوم جور و جبر سے حکومت کرے اور دوسروں کی محنت کی کمائی کا استحصال (XPLOITATION) انکا شعار ہو وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی خواہ وہ تمدّن و تہذیب کی کتنی بلندیوں تک کیوں نہ پہنچ چکی ہو۔ اور علومِ سائنس میں کتنی ہی آگے کیوں نہ بڑھ گئی ہو۔ قومِ عاد کی سرگزشت سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

۴۔ جس معاشی نظام میں ذرائع پیداوار، یعنی زمین اور اس کے متعلقات، پر ذاتی ملکیت جائز قرار دے دی جائے اور اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کیلئے کھلی نہ رہنے دی جائے، اس نظام اور اس کی حامل قوم کو دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ قومِ ثمود کی سرگزشت اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

۵۔ جس قوم کا کاروبار سرمایہ داری کے اصول پر قائم ہو۔ یعنی اس میں سرمایہ دار طبقہ کو کھُلی چھٹی ہو کہ وہ محنت کشوں کو جو جی میں آئے، دے اور صارفین (CONSUMERS) سے جتنا جی چاہے وصول کرلے۔ وہ ماپ اور تول کے پیمانے اپنی منفعت اور مصلحت کے مطابق رکھے اور اس پر اس سے بازپرس کرنے والا کوئی نہ ہو وہ قوم تباہ ہو کر رہتی ہے۔ یہ حقیقت قومِ حضرت شعیبؑ کی سرگزشت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

۶۔ اور اسی قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت بھی کہ جب مذہب کا دائرہ پوجا پاٹ تک محدود کر دیا جائے اور اس کی ہر ایک کو آزادی ہو لیکن کاروباری معاملات میں اسے دخل نہ دینے دیا جائے یعنی جہاں نظام سیکولر ہو۔ وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔

۷۔ اور قومِ لُوط کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم میں جنسی ضوابط اور پابندیوں سے بے اعتنائی برت کر فحاشی اور جنسی بد نہادی کو عام ہونے دیا جائے اس قوم کی کشتی بحر میت میں ڈوب جاتی ہے۔

۸۔ قومِ فرعون کے انجام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس قوم کی سیاست میں انداز ملوکانہ پیدا ہو جائیں۔ وہ قوم غرق ہو جاتی ہے۔ اندازِ ملوکانہ کی اُبھری ہوئی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں حکمرانی قانون کی نہیں ہوتی۔ ایک فرد یا افراد کے مجموعے کے فیصلوں کی ہوتی ہے اس میں قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور پھر پارٹیوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر ان کی اجتماعی قوت کو کمزور سے کمزور تر کیا جاتا ہے۔ اس میں، ان لوگوں کو آگے بڑھایا جاتا ہے، جن میں جوہرِ مردانگی نہ ہو اس لئے وہ ہیئتِ حاکمیہ کے تابع فرمان رہیں۔ جن لوگوں میں ذرہ برابر بھی غیرت و حمیّت کے آثار نمودار ہوں انہیں کچل کر رکھ دیا جائے۔

نیز اس نظام میں، رزق کے سرچشمے قوم کی تحویل میں رہنے کی بجائے ہیئتِ حاکمیہ کی ذاتی ملکیت متصوّر ہوتے ہیں اور اس طرح یہ حکمران طبقہ قوم کا اَن داتا بن کر انہیں انگلیوں پر نچاتا رہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ طبقہ مذہبی پیشواؤں کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اپنے حریفوں کو ان کے سپرد کر دیتا ہے تاکہ وہ عوام کے جذبات کو بھڑکا کر، انہیں ختم کر کے رکھ دے۔

۹۔ قوم بنی اسرائیل گویا ان تمام جرائم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ ان کا نظامِ زندگی، رِبٰو اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر استوار تھا۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ ان کا نظام کیپٹل ازم اور تھیاکریسی کے ستونوں پر قائم تھا۔ سرمایہ داروں کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ جس طریقے سے چاہیں دولت سمیٹتے چلے جائیں۔ بشرطیکہ وہ صدقے اور خیرات کے کاموں میں چندہ دے دیا کریں اور مذہبی پیشواؤں کے اقتدار کو قائم رکھیں ان کے لیڈروں کی حالت تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ان کی جھوٹی تعریفیں کرتے رہیں اور وہ کر کے کچھ نہ دکھائیں بلکہ محض بیان بازی کے زور پر پاپولیریٹی (POPULARITY) حاصل کرتے رہیں۔ جہاں تک مذہبی پیشواؤں کا تعلق ہے، مذہب ان کا پیشہ تھا اور دین فروشی ان کا ذریعۂ معاش وہ اپنے جی سے شریعت کے مسائل گھڑتے اور انہیں خدا کا دین کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ قوم مختلف مذہبی فرقوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان فرقوں کے امام، ایک دوسرے پر کفر کے فتوے عائد کر کے عوام کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ حکام کے ساتھ ان کی ساز باز اور جس شخص کو دیکھتے کہ وہ ان کی مفاد پرستیوں کے راستے میں حائل ہے۔ اس پر کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کر کے اس کی موت کے احکام صادر کرا لیتے۔

یہ تھے اس قوم کے کبیرہ جرائم جن کا نتیجہ ایک ایسی تباہی تھی جو دنیا میں ضرب المثل بن کر رہ گئی۔ اس قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم کے معاشرہ میں یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

اُصولِ حیات

۱ تمہیں یہ مقام، جسے استخلاف فی الارض کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے، ایمان اور عمل کے نتیجہ میں ملا ہے (۲۴/۵۵)
ایمان کے معنی ہیں مستقل اقدارِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم اور عمل کے معنی ہیں ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی کی تشکیل۔ جب تک تمہاری یہ کیفیت رہے گی تمہارا بلند و بالا مقام قائم و دائم رہے گا۔

۲ دوسرا اصول یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) جو مقام کسی قوم کو حاصل ہوتا ہے وہ اس سے کبھی نہیں چھنتا جب تک وہ اپنے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کر لے جو اسے اس مقام کا اہل نہ رہنے دے۔ نفسیاتی تبدیلی تعلیم و تربیت سے ہوتی ہے اس لئے اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اس انداز سے کرنا کہ ان میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر نہ واقع ہونے پائے جو انہیں تباہی کی طرف لے جائے۔

۳ اپنے ہاں معاشی نظام اس قسم کا رائج رکھنا جس میں ذرائع پیداوار اور مال و دولت ہر ایک کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کیلئے کھلے رہیں۔ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اگر تم نے اس قسم کے نظام سے اعراض برتا تو یاد رکھو! تمہاری جگہ کوئی اور قوم آجائے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی۔ (۷۰/۴۰)

۴ جب کسی قوم میں ظلم عام ہو جائے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۱/۱۱) ظلم کا مفہوم تو بڑا وسیع ہے لیکن اس کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس شے یا جس شخص کو جس جگہ ہونا چاہیئے اسے وہاں نہ رکھنا۔ ظلم سے قوموں کی جڑ اس طرح کٹ جاتی ہے کہ خلقِ خدا انکی تباہی پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۴۵)

۵ اور سب سے آخر یہ کہ دنیا میں حق اور باطل کی کشمکش ہر وقت جاری رہے گی۔ تم باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے مسلسل مصروفِ جدوجہد رہو اور اس مقصد کیلئے تمہیں جان تک بھی دینی پڑے تو بلا تامل و توقف دیدو۔ اگر دنیاوی جاذبیتوں نے تمہارا راستہ روک لیا اور تم نے جہاد سے گریز کیا تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا (۹/۳۹) تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

غلام رسول ازہر

خلیجی دیپک راگ

نگارِ آتشیں سارے، گل و لالہ تمہارے ہیں   دمادم آگ برساؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
اسے جینے کا حق کس نے دیا' وہ تو مسلماں ہے   "بزن" کا حکم فرماؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
اسے کیسے ہوئی جرأت' بنے وہ جو مری قوت   بڑا بے خوف ہے آؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
لبادہ اوڑھ کر انصاف کا نصرانیو آؤ   مری امداد فرماؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
اسے محصور کر لینا نہ جانے پائے وہ اب کے   لگاؤ گھاؤ پر گھاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
خدا کا گھر کھلا ہے' سامنے ارضِ پیمبر[۳] ہے   حرم میں ناز فرماؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
یہ کیسے اُجرتی قاتل نکمّے سے بلائے ہیں   وہ زندہ کیوں ہے بتلاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
زمین و آسماں پر آتش و آہن کی بارش ہو   الاؤ سارے دہکاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
خدا کو بھی ڈراؤ ناخداؤ آسمانوں پر   زمینوں پر بھی چھا جاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
اکیلا کیوں کھڑا ہے آج تک وہ سامنے سب کے؟   حواری سارے بلواؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
ہلاکو خاں کے وارث ہو' مگر تم ناخلف ٹھہرے   نتیجہ کچھ تو دکھلاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
یہ دولت سب کی سب یہ تیل کے چشمے تمہارے ہیں   نہ شرماؤ نہ گھبراؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
ملا موقع صلیبی جنگ کے بدلے چکانے کا   صلاح الدیں کو بتلاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
وہ بھائی ہے ہمارا بوٹیاں تم نوچ لو اُس کی   ہمارے سامنے کھاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
[۱] کہاں "فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا" لکھا ہے قرآں میں   خدارا یوں نہ جھٹلاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
[۲] کہاں پر ہے اخوّت کا وہ پارینہ سبق لکھا   عبث قصّے نہ دہراؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
[۳] کہاں لکھا' یہودی اور نصرانی نہ بلواؤ   نہ اپنا ہاتھ پکڑاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے

---

[۱] الحجرات (۴۹: ۹) وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا....
[۲] الحجرات (۴۹: ۱۰) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ
[۳] المائدہ (۵: ۵۱) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَ النَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ

وہی ہیں اولیاء اپنے وہی اپنے نگہباں ہیں　　خدامت بیچ میں لاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
نپٹ لیں آپ ہی اس سے کہ یہ جھگڑا گھریلو ہے　　یونہی جھانسے میں مت لاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
"وہ جارح ہے وہ جارح ہے" یہی بس راگنی ٹھہرے　　کہ دیپک راگ مت گاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
لگے بیٹھے ہیں کیوں چلمن سے اسرائیل کے بچے　　سرِ محفل انہیں لاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
شرابِ ناب کی محفل سجاؤ صحنِ مسجد میں　　خوشی سے رقص فرماؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
لگاؤ مصر کا بازار تم ارضِ مقدس میں　　زلیخاؤں کو بلواؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
بلاؤ رند سارے مغبچے جام و سبو لے کر　　شرابِ آتشیں لاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
رسول اللہؐ کے دشمن حرم میں خیمہ زن ہیں سب　　مگر ہرگز نہ گھبراؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے
وہی از ہر رہیں گے اب خلاؤں اور فضاؤں میں　　پڑیں گی سب کو بے بھاؤ کہ وہ گستاخ جارح ہے

مسلماں بھی بہت نادان ہیں سیدھے ہیں سادہ ہیں
کہیں دشمن سے خود "آؤ" کہ وہ گستاخ جارح ہے

---

۱ الحجرات: (۹:۴۹) فَإِنۢ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ

بارِ دگر یاد دہانی

ہرچند کہ قارئینِ طلوعِ اسلام کو یاد دہانی کی ضرورت نہیں، تاہم کمپیوٹر ایسے حضرات کی نشاندہی کر رہا ہے جن کی طرف سے نہ تو زرِ شرکت موصول ہوا ہے (سال سنہ ۱۹۹۱ء کیلئے) اور نہ ہی ان کے پیشگی کھاتہ جات میں خاطر خواہ رقم موجود ہے۔ ایسے تمام کرمفرماؤں سے التماس ہے کہ وہ زرِ شرکت بھجوا کر تجدید کروالیں تاکہ ترسیلِ رسالہ منقطع نہ ہو۔ لاہور کے علاوہ کسی بینک کا چیک بھجوانا ہو تو اس میں مبلغ ۲۰ روپے بنک چارجز شامل کرنا نہ بھولئے۔

ایڈیٹر

اِسلامی شریعت کے بُنیادی اصُول

۱۔ جب کوئی معاملہ زیرِ غور ہو تو اس کے متعلق سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اس کی بابت کیا اصول دیا ہے۔

۲۔ قرآنِ کریم عام طور پر زندگی کے معاملات کے متعلق اصولی تعلیم دیتا ہے۔ ان اصولوں پر مختلف زمانوں میں ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔

۳۔ لہٰذا دوسری بات دیکھنے کی یہ ہوگی کہ اس معاملہ کے متعلق ہمارے زمانہ کی ضروریات اور ہماری مملکت کے تقاضے کیا ہیں؟

۴۔ پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآن کے اس اصول کی کوئی عملی شکل احادیث کے مجموعوں میں، یا فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے؟

۵۔ اگر احادیث یا فقہ میں کوئی ایسی شکل مل جائے جو ہمارے زمانے کے تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک پورا کرتی ہے تو اس شکل کو اسی طرح اختیار کر لیا جائے۔

۶۔ اگر ان کتابوں میں کوئی شکل نہ ملے، یا ایسی شکل ملے جو ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کرتی ہو، تو جو شکل وہاں ملے اس میں مناسب ردّ و بدل کر لیا جائے یا حسبِ ضرورت کوئی شکل خود مرتب کر لی جائے۔

۷۔ اسلامی مملکت میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی۔ یعنی یہ مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ دیکھے کہ کوئی شخص یا اس کے بیوی بچے کسی حالت میں بھی بنیادی ضروریاتِ زندگی مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، دوائی وغیرہ سے محروم نہ رہے۔

۸۔ اس طرح یہ بھی مملکت کے ذمہ ہوگا کہ وہ ہر فردِ مملکت کی صلاحیتوں کے پورے پورے نشوونما کے لئے ضروری انتظام کرے۔

۹۔ مملکت ان اہم ذمہ داریوں سے اسی صورت میں عہدہ برا ہو سکتی ہے جب کہ رزق کے سرچشمے یعنی وسائل پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت سے نکال کر مملکت کی مشترکہ تحویل میں رکھے جائیں۔

۱۰۔ اس مملکت میں تمام افراد کو انصاف بلاقیمت ملے گا۔ یعنی کسی شخص کو عدالت سے فیصلہ لینے میں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑیگا۔

۱۱۔ اسلامی مملکت میں ہر کام کے لئے افراد کا انتخاب ان کے ذاتی جوہروں کی بنا پر ہوگا نہ کہ اضافی نسبتوں کی بنا پر۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کا بھی پورا پورا انتظام کرنا ہوگا کہ جن افراد کو ملت کسی فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے انتخاب کرتی ہے۔ انھیں عندالضرورت الگ کرنے کے اختیارات بھی ملت کے پاس رہیں۔ اس میں صدرِ ریاست سے لے کر چھوٹے سے فریضے

کے حامل سب شامل ہیں۔

۱۲۔ اسلامی مملکت میں قانون کی نگاہ میں سب یکساں ہوں گے اور حکومت کے ملازمین کو بھی اس باب میں کسی قسم کی کوئی خصوصیت نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ملازمین حکومت کو یہ حق ہوگا کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکیں۔

۱۳۔ اسلامی حکومت اس قسم کے نظام کی ابتدا اپنے ہاں سے کرے گی لیکن اس کے سامنے تمام نوعِ انسانی کی فلاح وبہبود ہوگی اور اس کا ہر قدم اسی منتہٰی کی طرف اُٹھے گا۔

۱۴۔ قانون کے الفاظ اور حکومت کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو، اگر کوئی دستور مندرجہ بالا ضروریات کو پورا کرتا ہے تو وہ اسلامی دستور کہلائے گا اور اگر ان میں سے کوئی ایک شق بھی پوری نہیں ہوتی تو اس مملکت کا دستور غیر اسلامی ہوگا۔

اگر آپ ان اصولوں سے متفق ہیں تو مجلسِ آئین ساز کے ارکین میں سے ایک ایک کو لکھئے کہ اگر وہ نفاذِ شریعت میں واقعی مخلص ہیں تو کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ان اصولوں پر مبنی شریعت بل اسمبلی میں پیش کریں۔

سُنّتِ رسُولؐ اللہ کے متعلق طلوعِ اسلام کا مسلک

حافظ زین الدین عراقی، جو بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرتِ منظوم کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

ویعلم الطالب ان السیر تجمع ما صحّ ما قد انکر

طالب کو جاننا چاہیئے کہ سیرت میں سبھی قسم کی روائتیں ہوتی ہیں صحیح اور غلط بھی۔

طلوعِ اسلام بھی یہی کہتا ہے اور یہ جانچنے کے لئے کہ کون سی روایت صحیح ہے اور کون سی غلط، یہ معیار مقرر کرتا ہے کہ

۱۔ جو روایت قرآن کے خلاف جاتی ہو وہ غلط ہے۔ اس لئے کہ حضور رسالتمآبؐ کا کوئی قول یا عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔

۲۔ جس روایت سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہوتی ہو وہ صحیح نہیں ہوسکتی کیونکہ حضورؐ سیرت وکردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ معراجِ انسانیت کا آئینہ تھی۔

اگر کوئی شخص اس مسلک کو قابلِ اعتراض سمجھتا ہے تو طلوعِ اسلام اس کے اس اعتراض کو کوئی وقعت نہیں دیتا، اس لئے کہ اس کے نزدیک ذاتِ رسالتمآبؐ کی عظمت ان اعتراضات سے بہت بلند ہے۔

اور اگر کوئی شخص اس باب میں اس کے سوا کوئی اور بات طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کرتا ہے تو وہ تہمت تراشتا اور غلط پروپیگنڈہ کرتا ہے۔

نظامِ حکومت کا قرآنی تصوّر

دنیا کا کوئی نظامِ حکومت بھی لیجئے اس میں کسی نہ کسی شکل میں بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر اقتدار ضرور قائم رہتا ہے۔ قرآنِ کریم اس تصوّر کو وجہ تذلیلِ انسانیّت قرار دیتا ہے کہ کسی انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار ہو۔ وہ اسے مساواتِ انسانیہ کے خلاف اور احترامِ آدمیّت کے منافی ٹھہراتا ہے۔ وہ انسانوں کی انسانوں پر حکومت کے تصوّر کو باطل قرار دیتا ہے کیونکہ اس سے فرد اس آزادی سے محروم ہو جاتا ہے جو اسے انسان ہونے کی حیثیّت سے حاصل ہونی چاہیئے۔

لیکن نظامِ حکومت کے بغیر تو مدنی الطبع انسان کا معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اس سے یہ سوال سامنے آئے گا کہ قرآن، اس مسئلہ کا حل کیا بتاتا ہے۔ وہ اس کا حل یہ بتاتا ہے کہ انسانوں پر حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس سے ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس طرح تو پھر پھرا کر ہم وہیں جا پہنچے جہاں ہم تھیاکریسی یا مملکتی تصوّر کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہاں بھی حقِ حکومت ان قوتوں کا بتایا جاتا تھا جن کا تعلق عالمِ محسوسات سے نہیں۔ یہاں بھی انسانوں کو اس ہستی کے زیرِ اقتدار لایا جاتا ہے جسے نہ وہ دیکھ سکتے ہیں، نہ ان کی بات سُن سکتے ہیں، نہ اس سے کچھ کہہ سکتے ہیں، نہ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہم سے کہا جاتا ہے کیا وہ آپ کا ارشاد ہے، اور جو کچھ ہم سے مانگا جاتا ہے۔ کیا وہ آپ ہی کا مطالبہ ہے؟ یہ سوال بڑا معقول ہے، لیکن اس کا جواب معقول تر۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظامِ حکومت میں بے شک تمہارا تعلق ایک غیر محسوس، غیر مرئی ہستی (خدا) سے ہوتا ہے لیکن اس نے اپنے نظامِ حکومت کے لئے ایک ضابطۂ قوانین و اقدار دے دیا ہے جو محسوس بھی ہے اور مرئی بھی۔ اسے تم دیکھ سکتے ہو، پڑھ سکتے ہو۔ سمجھ سکتے ہو۔ **خدا کی حکومت** سے مراد اس ضابطۂ قوانین و اقدار کی اطاعت ہے۔ یہ ضابطہ مکمّل بھی ہے اور غیر متبدّل بھی۔ اس لئے اس میں نہ کوئی مذہبی پیشوائیت کسی قسم کا حک و اضافہ کر سکتی ہے، نہ کوئی سیاسی اعتبار سے ذی اقتدار، کسی قسم کا تغیّر و تبدّل۔ خدا نے اور تو اور، خود رسول اللہ صلعم سے بھی

کہہ دیا کہ: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵ : ۴۸) ”ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ، کتاب اللہ کے مطابق کرو“۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اس بات کا اعلان کردو کہ :

مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ (۱۰/۱۵)

”مجھے اس کا کوئی اختیار نہیں کہ میں اس میں کسی قسم کا تغیّر و تبدل کرسکوں“

کتنا بڑا ہے اطمینان جو اس طرح افرادِ معاشرہ (بلکہ نوعِ انسانی) کو حاصل ہوگیا کہ ہم پر حکومت صرف اس کتاب کی ہوگی، حکم صرف اس کا چلے گا۔ اس سے ہٹ کر، کوئی ہم سے کسی قسم کا حکم منوانے کا اختیار و اقتدار نہیں رکھے گا۔ حتّٰی کہ جو ہم سے اس کے قوانین کی اطاعت کرائے گا وہ پہلے خود اس کی اطاعت کرے گا۔ اس اعتبار سے نہ کوئی حاکم ہوگا نہ محکوم۔

(طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۷۸ء سے ماخوذ)

حدیث کے متعلق طلوعِ اسلام کا مسلک

”یہ حقیقت یقیناً ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لیکر اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات بھی ایسی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، انھیں ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا ردّوبدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی واسطہ نہیں۔“ (سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیمات حصہ دوم صہ ۲۶-۳۲۷)

طلوعِ اسلام کا بھی یہی مسلک ہے کہ قرآنی اصولوں کی جزئیات نبی اکرمؐ نے متعین فرمائی تھیں، اگر ان میں سے کسی میں زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت ہو تو وہ تبدیلی کی جاسکتی ہے لیکن

(۱) یہ تبدیلی صرف وہ اسلامی نظام کر سکتا ہے، جو علیٰ منہاجِ نبوت، قرآنی حکومت کے قیام کے لئے وجود میں آئے۔ ہمیں یا آپ میں سے کسی فرد کو اس تبدیلی کا حق نہیں اور

(۲) جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو اور وہ ایسی تبدیلی نہ کردے اس وقت تک ان احکام میں کوئی ردّوبدل نہیں کرنا چاہیئے۔

اگر کوئی شخص اس باب میں طلوعِ اسلام کے متعلق کچھ اور کہتا ہے تو وہ جھوٹا پروپیگنڈہ کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُکافاتِ عمل

دین کا مدار خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے۔ دین کا مدار ہی نہیں بلکہ تمام کارگہ کائنات کا مدار۔ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ ہر کام اپنا متعین نتیجہ پیدا کرکے رہتا ہے۔ خارجی کائنات کی ہر شے، قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔ اس لئے وہاں ہر حرکت کا متعینہ نتیجہ از خود مرتّب ہوتا چلا جاتا ہے اسے LAW OF CAUSE AND EFFECT) کہا جاتا ہے لیکن انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ اس لئے یہ خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق بھی زندگی بسر کرتا ہے اور ان کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے۔ جب وہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو اس کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے۔ اور جب یہ ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کا نتیجہ تخریبی ہوتا ہے۔ یعنی اس سے اس کی ذات پستیوں کی طرف گر جاتی ہے۔ اور جس قسم کے افراد ہونگے اسی قسم کا معاشرہ ہوگا۔ لہٰذا معاشرہ کا دار و مدار بھی قانونِ مکافاتِ عمل پر ہوگا یعنی کائنات کی کوئی شئے یا نظام اس قانون کے احاطہ سے باہر نہیں۔

یہی قانونِ مکافات۔ افراد کی طرح قوم میں بھی عمل پیرا رہتا ہے۔ صحیح روش پر چلنے والی قوم کو عروج اور ترقی حاصل ہوتی ہے، غلط روش پر گامزن، زوال و ہلاکت کے گڑھوں میں گر جاتی ہے۔

ہر عمل کا نتیجہ تو اسی وقت مرتّب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس طور پر اسی وقت سامنے نہیں آجاتا۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے کے وقفہ کو مہلت کی مدت کہا جاتا ہے۔ اگر اس دوران میں اس شخص سے کوئی زیادہ بڑا کام سرزد ہوتا ہے تو وہ عمل اس کے سابقہ غلط عمل کے تخریبی نتیجہ کو مٹا دیتا ہے۔ اسے توبہ اور مغفرت کہتے ہیں۔

دراصل کائنات میں، حق اور باطل (تعمیری اور تخریبی قوتوں) میں ہر وقت ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ جب تک تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری رہتا ہے، انسان تباہی سے محفوظ رہتا ہے۔ جب وہ پلڑا ہلکا ہو جاتا ہے تو اس پر تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ مہلت کے وقفہ میں، زیادہ بڑے تعمیری کام کے سرزد ہونے سے مراد یہ ہے

وہ انسان اپنے تعمیری کام سے پلڑے کا وزن بڑھالیتا ہے۔ یعنی اس کی قوتِ مدافعت بڑھ جاتی ہے جس سے تخریبی قوتوں کے تباہ کن نتیجہ سے محفوظ رہتا ہے۔

اعمال کے نتائج محسوس طور پر اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں، جو یہاں سامنے نہیں آتے۔ وہ مرنے کے بعد ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ حیاتِ آخرت کا منکر یہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ کسی طرح اس دنیا میں اپنے غلط کردار کے تباہ کن نتائج سے اپنے آپ کو بچالے تو پھر اس کو کسی قسم کا خوف و خطر نہیں لیکن قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانی زندگی اس دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص اپنے غلط کردار کے تباہ کن نتیجہ سے کسی طرح بچ بھی جائے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ نتائج مرنے کے بعد سامنے آجائیں گے۔

قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کا نتیجہ عام طور پر فوراً محسوس ہو جاتا ہے اور اس سے کوئی دوسرا اسے بچا نہیں سکتا۔ مثلاً ایک شخص آگ میں انگلی ڈالتا ہے تو اس کی انگلی جل جاتی ہے۔ اس سے اسے سخت درد ہوتا ہے۔ یہ اس کے عمل کا محسوس نتیجہ ہے۔ یہ درد، نہ کسی سفارش سے کم ہو سکتا ہے۔ نہ رشوت دینے سے۔ نہ ہی کوئی بڑے سے بڑا غمگسار اس کے درد کو اس سے اپنی طرف منتقل کر سکتا ہے۔ اسے اپنے کئے کی سزا خود ہی بھگتنی پڑتی ہے۔ اس درد کی اذیت سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان وہ دوا استعمال کرے جو خدا نے اس قسم کے درد کے لئے پیدا کر رکھی ہے یعنی وہ قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کے نتیجہ سے بچنے کے لئے، قانونِ خداوندی ہی کی طرف رجوع کرے۔ اسے رجوع الی اللہ کہتے ہیں اور خدا کی طرف سے اس قسم کی دوا کا پیدا ہونا اس کی رحمت کہلاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا کا جو قانون (سنّت اللہ) طبعی دنیا میں کارفرما ہے۔ اسی قسم کا قانون، خود انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ اس کے لئے بھی اس نے کچھ قوانین مقرر کر رکھے ہیں جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مستقل قدر کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس سے اس کی ذات میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ (اسے اس قانون شکنی کی سزا کہہ لیجئے۔) کسی کی سفارش۔ کسی قسم کی رشوت۔ کوئی کفّارہ۔ کوئی فدیہ اس نتیجہ کو مٹا نہیں سکتا۔ ہاں اگر وہ شخص پھر اسی مستقل قدر۔ یا کسی دوسری قدر۔ پر عمل پیرا ہو تو اس سے اس کی ذات میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس تخریب کا مقابلہ کر سکتی ہے جو پہلی غلط روش سے پیدا ہوئی تھی۔

یوں خدا کا **قانونِ مکافات** انسانی دنیا میں کارفرما ہوتا ہے۔

تھیاکریسی نہیں ہوگی

پاکستان، کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتّب کرنا ہے میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہوسکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہوسکتے تھے۔

اسلام نے

ہمیں **وحدتِ انسانیت** اور ہر ایک کے ساتھ **عدل و دیانت** کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتّب کرنے کے سلسلے میں جو ذمّہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو

یہ بات مسلّمہ ہے

کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی **تھیاکریسی** رائج نہیں ہوگی۔ جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں ــــــــ

(قائدِاعظم کا، اہلِ امریکہ کے نام براڈ کاسٹ، فروری ۱۹۴۸ء، بہ حیثیت گورنر جنرل)

قرآنی تعلیم، بچوں کیلئے

قاسم نوری

آخرت

السّلام علیکم بچو! ایک لفظ ہوتا ہے "اوّل" اور ایک لفظ ہوتا ہے "آخر" "اوّل" آغاز کو کہتے ہیں یعنی جو چیز جس جگہ سے شروع ہو وہ 'اوّل' کہلاتی ہے اور جو چیز جہاں جاکر ختم ہو جائے وہ 'آخر' کہلاتی ہے۔ اسی لفظ 'آخر' سے بنا ہے "آخرت" یعنی وہ موڑ (TURN) جہاں پہنچ کر بظاہر ایک چیز ختم ہو جائے لیکن ختم نہ ہو بلکہ وہاں سے کسی دوسری سمت میں مڑ جائے۔ بھئی تم نے ایسی سڑک ضرور دیکھی ہوگی، جو کہیں نہ کہیں ختم تو ہو جاتی ہے لیکن جہاں وہ ختم ہوتی ہے اسی جگہ سے کوئی دوسری سڑک شروع بھی ہو جاتی ہے۔ بس اسی کو آخرت کہتے ہیں ــــ لیکن "آخرت" کا لفظ اردو انسائیکلوپیڈیا کے مطابق "اگلی دنیا" یعنی موت کے بعد کی دنیا یا زندگی کے لئے مخصوص ہو گیا ہے؛ یعنی وہ دنیا یا مقام جہاں تمام انسان اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کیلئے اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے اور جہاں "دوزخ" ہوگی اور "جنّت" ہوگی اور فیصلہ ہوگا کہ کون جنّت کا مستحق ہے اور کسے دوزخ میں رہنا ہے ــــ؛ آخرت کہلاتا ہے۔

ننھّے دوستو! جب ہم مر جاتے ہیں نا ــــ، تو قرآن کریم کی رُو سے ہماری

زندگی ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ زندگی تو ختم کبھی ہوتی ہی نہیں بس آخرت کی طرف مُڑ جاتی ہے اور جسے ہم مَوت کہتے ہیں یا مرجانا کہتے ہیں تو وہ یوں سمجھو کہ اس زندگی کا آخری سرا ہوتا ہے، یعنی بظاہر زندگی ختم ہو رہی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ختم نہیں ہو رہی ہوتی بلکہ دوسری طرف TURN لے رہی ہوتی ہے

اس حقیقت کو جب تک نہ مانا جائے اور اس پر جب تک ایمان نہ لایا جائے کوئی مسلم یا مومن نہیں ہو سکتا — یعنی مومن وہ ہوتا ہے جو 'آخرت' یعنی مرنے کے بعد کی زندگی کو مانتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخرت کی زندگی کیا ہے، کیسی ہے؟ تو بھئی! اس کے بارے میں کوئی کچھ بھی نہیں بتا سکتا، کیونکہ وہاں سے تو آج تک کوئی پلٹ کر آیا ہی نہیں۔ بس ہم کو اتنا ہی معلوم ہے جتنا "وحی" کے ذریعے سے خود اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے اور وہ صرف اتنا بتایا ہے کہ "آخرت" کی زندگی کا سارا دار و مدار ہماری موجودہ زندگی پر ہے یعنی ہم جو جو کام (عمل) اس زندگی میں کریں گے اس کے مطابق وہاں کی زندگی ہوگی۔ اگر اس زندگی میں اچھے کام کریں گے تو آخرت اچھی ہوگی۔ بُرے کام کریں گے تو آخرت بُری ہوگی۔ اسی کو "مکافاتِ عمل" بھی کہتے ہیں اور اسی کا نام جنّت اور جہنّم بھی ہوا کرتا ہے۔

ننھّے ساتھیو! تم کسی ایسے مُلک میں چلے جاؤ، جہاں کی زبان نہ جانتے ہو، لوگ بھی واقف نہ ہوں۔ کرنسی بھی دوسری ہو، وہاں کوئی واقف، دوست

رشتہ دار بھی نہ ہو ــــ اور تمہارے پاس جو رقم اور پاسپورٹ ہو وہ بھی گم ہو جائے تو سوچو کیا کرو گے؟ واپس آ نہیں سکتے کہ پاسپورٹ نہیں ہے، وہاں رہ نہیں سکتے کہ کرنسی بھی نہیں ہے، اور کوئی واقف بھی نہیں ہے۔ بس جہاں کھڑے ہو وہیں کھڑے کے کھڑے رہ جاؤ گے۔ روتے، بلکتے، تڑپتے اور پچھتاتے ہی وقت گزرے گا نا؟ خوف اور بھوک سے کتنا بُرا حال ہو گا۔

بس آخرت کو بھی ایسا ہی ملک سمجھ لو۔ وہاں سے واپسی بھی ناممکن ہے اور وہاں جا کر موت بھی نہیں آئے گی۔ اب جس کے پاس جتنی کرنسی ہو گی وہ اتنے ہی دن جی لے گا اور پتہ ہے وہاں کی کرنسی کون سی ہے۔ وہاں کی کرنسی ہے، اس زندگی میں کئے جانے والے "اچھے اچھے کام"۔ جس انسان نے اس زندگی میں اچھے کاموں کی کرنسی جتنی زیادہ اکھٹی کر لی اتنا ہی شاندار وہاں کا قیام اور سفر ہو گا ــــ اور جس نے کوئی اچھا کام نہ کیا۔ اس کے حصّہ میں آنسو، پچھتاوا، خوف اور دُکھ ہی دُکھ ہو گا۔ جہاں کھڑا ہے وہیں کھڑا رہ جائے گا۔ نہ آگے بڑھ سکے گا نہ ترقّی کر سکے گا۔ یہی جہنّم ہو گا جس سے نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہو گی۔

تم سے قطعاً نہیں پوچھا جائیگا

کہ تمہارے اسلاف نے کیا کیا تھا۔ تم سے یہ پوچھا جائیگا
کہ تم نے کیا کیا تھا ــــ (۲:۱۳۴) (۲:۱۴۱)

علامہ غلام احمد پرویز کا درسِ قرآنِ کریم

درج ذیل مقامات پر ہوتا ہے!

شہر	مقام	دن	وقت
لاہور	۲۵ بی گلبرگ ۲ (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	۹:۳۰ بجے صبح
چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	؍؍	۳ بجے بعد نمازِ جمعہ
پشاور	بر مکان محترم عبدالرزاق۔ نزد چوک شہیداں قصہ خوانی بازار	بدھ	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍
کوئٹہ	۱۶۶/ڈی جائنٹ روڈ	جمعۃ المبارک	۴ بجے صبح
ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	؍؍	۱۰ بجے صبح
کراچی	۲۲۸ رشرف آباد، رابطہ محترم خالد گل، فون ۵۳۹۲۸۹		
	کورنگی، رابطہ محترم محمد سرور: فون ۳۱۲۶۳۱		
	کھڈہ مارکیٹ، رابطہ جمعہ بھائی، فون ۷۴۲۰۳۸		
	جمعہ بھائی۔ نیو کلری۔ منگورہ آباد۔ گلی ۱۳ بی		
	لیاری کراچی۔ فون: ۷۴۲۰۳۸		
پیر محل	مکان ۱۴۰/۱۳۹۔ مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	۹ بجے صبح
گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نمازِ جمعہ
سرگودھا	۶۰۔ اے سول لائنز۔ ریلوے روڈ	؍؍	۹ بجے صبح
سید حسن	بر مکان محترم سید محمد حسین	؍؍	۲½ بجے شام
جہلم	بر مکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد۔ جی ٹی روڈ	؍؍	۶ بجے شام
پنج کسی	بر مطب حکیم احمد دین	؍؍	۳ بجے سہ پہر
چک ۲۱۵ ای بی	بر مکان چوہدری عبدالحمید	؍؍	۸ بجے صبح

شہر	مقام	دن	وقت
ایبٹ آباد	۲۳۴ ۔ کے ایل کیہال	جمعۃ المبارک	۱۰ ۔ بجے صبح
برمنگھم یوکے	229 ALUM ROCK ROAD BIRMINGHAM	اتوار	۳ ۔ بجے سہ پہر
ٹورنٹو	716 THE WEST MALL 1904 KTOBICOKE	ہر ماہ پہلا اتوار	۱۱ ۔ بجے صبح
اوسلو	KEYSER GT 1 HALL D	ہر ماہ پہلا اتوار	۴ ۔ بجے شام
ڈنمارک	GL KONCEVEJ 47, 3TH DK 1610 KBH V	ہر ماہ آخری ہفتہ	۲ ۔ بجے سہ پہر
حیدر آباد	گولڈن سینٹری ۔ عثمان آباد	جمعۃ المبارک	۵ ۔ بجے شام
لیّہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	″	بعد نماز مغرب
لندن	PARK RD ILFORD ESSEX TEL 081-553-1896	ہر ماہ پہلا اتوار	۲:۳۰ بجے سہ پہر
بُورے والہ	بر مکان محمد اسلم صابر ۔ مرضی پورہ گلی ۵	ہر ماہ پہلا ۔ تیسرا جمعہ	۹ ۔ بجے صبح
رجانہ	بر مکان چوہدری ایس ۔ ایم صادق مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	۱۰ ۔ بجے
گجرات	مرزا ہسپتال ۔ کچہری روڈ	جمعرات	۳ ۔ بجے سہ پہر
جلال پور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	″	۱۰ ۔ بجے صبح
فیصل آباد	۲۳ ۔ سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل)	بروز جمعہ	۳:۳۰ بجے سہ پہر
	رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک: فون ۴۲۸۵۵		
	کارخانہ نٹ سازی گلی ۱۳ محلہ فیض آباد رابطہ فون: ۲۲۸۵۴ مرزا محمد صدیق	سوموار	۴ بجے سہ پہر

قرآن سنیئے ــــ قرآن سمجھئے ــــ قرآن پر عمل کیجیئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق[1]) قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورہ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:

(۱) یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

"اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پہلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔"

(۲) اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ ——— "یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں"

(۳) فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ

"پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے"

(۴) وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ

(۵) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ھے

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ.....

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ (۱۸۵ - ۲/۱۸۳)

---

[1] ۔ ان احکام کو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار درج کر چکے ہیں لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں۔ اسلئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے۔

" لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو۔۔۔۔۔۔۔ تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے۔"

(۸) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (۲/۱۸۷)

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیّز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (۲/۱۸۷)

اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ :۔

۱ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)

۲ روزے میں اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

۳ روزے اس کیلئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کردے۔

۴ اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے۔ لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کردے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۲ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلادیں۔

غور فرمائیے! اوپر کی چاروں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ ـــــ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں ـــــ کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہو ـــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلادیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشأ

یہ نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ 'طاقت' کا ترجمہ اردو کے لفظ 'طاقت' سے کر دیا۔ ان دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم ص ۱۳۰۴ میں ہے۔

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَتَلَنَا بِہٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اس طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب ص ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

> طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار ص ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں۔

> اِطَاقَۃٌ دراصل مَکْنَتٌ اور قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْئَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو یعنی بدشواری اسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دُور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے...۔ اسی بنا پر امام راغب نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:۔

> طَاقَۃٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں۔ جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف ص ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے۔

> عربی زبان میں اَلْوُسْعَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَۃٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیر نظر) کے

معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدّت اور مشقّت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے ..... (روح المعانی صـ ۵۹ جلد ۲)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طاقۃ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهٗ کا ترجمہ ——— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ——— کر دینا کس قدر غلط فہمی کا موجب ہو سکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ ——— اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ..... کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امّت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے ۔ چنانچہ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهٗ میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے ۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقّت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ علّامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" صـ ۲۶۸ ۔ ۲۶۹ جلد ۲ میں ہے کہ :

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقّت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں ۔ ان کیلئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمّے کیا ہے ؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمّے کچھ بھی نہیں ہے ۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ ، ابن عباسؓ ، قیس بن السّائب اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمّہ فدیہ ہے ۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرّائے (حنیفہ) امام احمد اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے ۔ نیز ابن عبّاس کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی امّ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچّہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو اُن لوگوں میں سے ہے جو بمشقّت روزے رکھ سکتے ہیں ۔ لہٰذا تیرے ذمّے فدیہ ہے قضا نہیں ۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے ۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

> الَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے ، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی ۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے ضمرے میں شمار ہونگے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُرمشقّت کاموں میں رکھ دی ہے ۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے

اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقّت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو ..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دُور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو ۔ روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا ۔ اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو ۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقّت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت ۔ ان سب لوگوں کیلئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں ۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے ۔ (تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ تا ۱۵۷ جلد ۲)

اِن تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتّب ہو جاتی ہے :

۱ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت

۲ حاملہ عورتیں ۔

۳ دودھ پلانے والی عورتیں

۴ اپاہج اور معذور لوگ

۵ پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقّت رکھ سکیں

۶ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (CONSTITUTIONAILY) کمزور پیدا ہوئے ہوں

۷ وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُرمشقّت کاموں میں ہوتی ہے مثلاً کانوں میں کام کرنے والے کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے ۔

۸ وہ مجرم جن سے جیل میں مشقّت کے کام لئے جاتے ہوں ۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں ۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقّت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے ۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام ۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآنِ کریم میں دیکھ لیں ۔ (یعنی سورۂ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجتماعی زندگی

اسلام دین ہے مذہب نہیں۔ مذہب میں زندگی کا مقصد ایک فرد کی اپنی نجات ہوتا ہے۔ اس کیلئے وہ خدا سے اپنا پرائیویٹ تعلق قائم کرتا ہے۔ وہ جس قدر انسانوں سے دُور ہٹتا جائے اتنا ہی خدا کے "قریب" ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے وہ، عبادت یا بھگتی یا پرستش کیلئے الگ گوشہ تجویز کرتا ہے۔ اس تنہائی میں وہ خدا سے لو لگاتا ہے۔ پھر وہ جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہے، دنیا سے دُور ہٹتا جاتا ہے چنانچہ خدا کے مقرب بندوں۔ ایشور کے بھگتوں، کی نشانی یہ ہے کہ وہ الگ خانقاہوں یا حجروں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور جنگلوں یا غاروں میں چلے جاتے ہیں اور دنیا کے دھندے دنیاداروں کے سپرد کر دیتے ہیں کیونکہ دنیا اور اس کی جاذبیتیں خدا کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ اس لئے قابلِ نفرت ہیں۔

دین کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ انسان کو دنیا میں رہنا سکھاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کا ہر کام جو وحیٔ خداوندی کی روشنی میں سرانجام دیا جائے دین بن جاتا ہے۔ دین نام ہے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں مستقل اقدار کے مطابق، نوعِ انسان کی بہبود کے لئے صرف کرنے کا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے اجتماعی زندگی کی ضرورت ہے۔ دین نام ہی اجتماعی نظامِ حیات کا ہے جو وحی کی مقرر کردہ حدود کے اندر متشکل ہو۔ اس اجتماعی نظام کے اندر، افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس سے ایک عجیب و غریب حسین دائرہ وجود میں آتا ہے افراد اپنی صلاحیتوں کو اجتماعی نظام کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ وہ انہیں انسانیت کی تعمیر کے کاموں میں صرف کرے اور اجتماعی نظام ان افراد کی صلاحیتوں کی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس لئے اسلام میں نہ فرد بلا جماعت کا تصور ہے نہ جماعت، کا وجود مقصود بالذات ہے۔ جماعت کا مقصد فرد کی نشوونما ہے (اس کی طبعی زندگی کی پرورش بھی اور اس کی ذات کی نشوونما بھی) قرآن تصور ہی اجتماعی زندگی کا دیتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ "یاایھا الذین امنوا" یعنی جماعتِ مومنین سے خطاب کرتا ہے۔ افراد سے الگ الگ نہیں۔ حتیٰ کہ افرادِ امت کی دعائیں بھی (جو قرآنِ کریم میں آئی ہیں) اجتماعی ہیں، انفرادی نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ وہ ایک

امت تیار کرتا ہے جو دین کے نظام کو قائم کرتی ہے۔ اسے آج کی اصطلاح میں، نظامِ معاشرہ یا نظامِ مملکت کہہ لیجئے۔ لیکن نظامِ مملکت کا تصور محدود ہوتا ہے۔ اس میں نگاہ صرف سیاسی امور تک جاتی ہے۔ قرآن کا نظامِ اجتماعی، انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں جماعت کا لفظ تو نہیں آیا لیکن اس کی پیش فرمودہ تعلیم پر غائر نگاہ ڈالی جائے تو اس سے صاف نظر آجائے گا کہ اس کا مقصد امتِ مسلمہ کے سامنے اجتماعی زندگی کا تصور پیش کرنا ہے۔ اسی سے وہ دین بنتا ہے۔

وَ اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (۳/۱۰۲)

اس کی بنیادی سند ہے۔ وہ اعتصام بحبل اللہ کو اجتماعی قرار دیتا ہے، انفرادی نہیں۔ اسی کو اجتماعی زندگی یا جماعتی نظم و نسق کہتے ہیں۔

معتقدات

"اسلام اس کا سخت مخالف ہے کہ معتقدات کے معاملہ میں کورانہ تقلید کی جائے اور مذہبی فرائض کو رسماً ادا کر لیا جائے اسلام نے جہالت اور تعصب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور انسانی عقل و فکر کو خواب سے بیدار کیا۔ اس نے کہا کہ انسان اس لئے نہیں بنایا گیا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی مہار پکڑ کر اسے چلاتا جائے۔ وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ عقل و فکر اور علوم و فنون کی روشنی میں اپنی راہ نمائی آپ کرے۔ یعنی علومِ فطرت (سائنس) اور تاریخی شواہد کی مشعل ہاتھ میں لیکر آگے بڑھتا چلا جائے۔ اسلام اس کا سخت مخالف ہے کہ جو باتیں ہمارے پاس ہمارے اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں، انھیں بلا تحقیق و تنقید صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا جائے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ محض یہ بات کہ ایک شخص ہم سے پہلے گذر چکا ہے اس کی سند نہیں ہو سکتی کہ وہ شخص علم میں ہم سے بڑھ کر اور فہم و فراست میں ہم سے آگے تھا۔ فطری استعداد اور قلب و دماغ کی صلاحیتوں کے اعتبار سے اسلاف اور اخلاف میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔

اس طرح اسلام نے انسانی فکر و بصیرت کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا جس میں وہ صدیوں سے جکڑے چلی آرہی تھی۔ اور اسے کورانہ تقلید سے نجات دلا کر آزادی کی وہ فضائے بسیط عطا کر دی جس میں وہ اپنی جدوجہد سے اپنے لئے آپ فیصلے کر سکے۔ صرف اس شرط کے ساتھ کہ جو حدود و قوانین خداوندی نے متعین کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔ ان حدود کے اندر انسانی علم و عقل پر کوئی پابندی نہیں عائد کی گئی، نہ ہی اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں۔"

(مفتی محمد عبدہٗ مرحوم، در رسالۃ التوحید)

علّامہ غلام احمد پرویزؒ

حج کا مقصد

(جب حج کا زمانہ قریب آتا ہے تو تقاضے موصول ہونے لگ جاتے ہیں کہ حج کے مقصد کے متعلق لکھا جائے۔ ہم اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن احباب کے مطالبہ کے پیشِ نظر ہم ذیل میں پرویز صاحب کی وہ تقریر درج کرتے ہیں جو انہوں نے نومبر ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان سے نشر فرمائی تھی۔)

اس سرزمین پر جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے یہ ایک اہم سوال کے حل میں غلطاں و پیچاں نظر آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں نے باہم مل جل کر رہنا ہے اور جب وہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس تصادم اور ٹکراؤ سے فساد کی چنگاریاں اٹھتی ہیں جو ان کے خرمنِ امن و سلامتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں۔ وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ مضطرب و بےقرار رکھا ہے، یہ ہے کہ کونسی شکل پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن و سلامتی سے رہ سکیں۔ انسانیت کی تاریخ اسی سوال کے حل کی مسلسل داستان ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا سوچا اور تجربہ نے اسے کس طرح غلط ثابت کر دیا۔ قرآن نے انسان کی اس کوشش اور کوشش کے مآل کو ایک چھوٹی سی مثال میں اس طرح واضح کر دیا ہے کہ نگہِ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے وجد و کیف سے جھوم اٹھتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (۱۶/۹۲)

"تمہاری مثال اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور (پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے) اسے بکھیر ڈالا"

قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھیئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھیئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے حوادث ہیں جو ان میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جدوجہد کی تاریخ پر غور کیجئے۔ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظامِ تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس عمارت کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ وہ ایک عرصہ

تک اپنے تصورات کی دنیا میں محو رہتا ہے لیکن ابھی وہ عمارت تکمیل تک بھی پہنچنے نہیں پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اس عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین مرقع خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا، جس کی ٹھیکریاں اس کے مٹے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیثِ اَلم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا مصر اور یونان، چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشمِ عبرت سے دیکھئے اور سوچئے کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہی ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

ادوارِ سابقہ کی طرح عصرِ حاضر کے انسان نے بھی اس سوال کے حل میں دماغ سوزی کی اور اس کی فکر و کاوش کا نتیجہ نیشنلزم (قومیت پرستی) کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ جس پر اقوامِ مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوامِ عالم کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ یورپ نے اس نسخۂ کیمیا کو اس قدر کامیاب قرار دیا کہ ان کے آئینۂ فکر میں قومی محبت (PATRIOTISM) کو شرفِ انسانیت کی انتہا تصور کر لیا گیا ہے۔ لیکن جنگِ اول نے بالعموم اور اس کے بعد جنگِ دوم کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب نے بالخصوص اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ جسے تریاق سمجھا جاتا تھا وہ انسانیت کیلئے زہرِ قاتل ہے۔ چنانچہ دانایانِ مغرب اپنی اس سُوت کی انٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے بکھیرنے کی فکر میں ہیں۔ ڈاکٹر ہکسلے نے ۱۹۴۷ء میں کہا تھا۔

> "قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بہ حیثیتِ انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے۔ باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے"۔

اب اسی مسئلہ کا حل یہ سوچا جا رہا ہے کہ مختلف اقوام کے گروہوں کو ملا کر متحدہ حکومتیں قائم کی جائیں حتّٰی کہ تمام اقوامِ عالم کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اقوامِ یورپ کو ایک گروپ بنا لینے کی تجویز یا مجلسِ اقوامِ متحدہ اور ان کی حفاظتی کونسل کا قیام یا وِنڈل ولکی کا (ONE WORLD) کا تصور اسی انتہا کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال اقوامِ مغرب کے موجودہ تصورِ حیات کے ماتحت عملی طور پر اس کا امکان ہو یا نہ ہو نظری طور پر اب یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ تمام دنیا کو ایک برادری تصور کر کے ان کے تمدنی مسائل کی پیچیدگیوں کا حل سوچا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر (GAULD) ــــــ اپنی کتاب (MAN, NATURE, AND TIME) میں لکھتا ہے:۔

"اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔"
یہ ہے وہ حل جس تک ذہنِ انسانی بیسویں صدی تک پہنچ سکا ہے لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر جب کہ دنیا کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے رہنے والے دوسرے گاؤں کے باشندے سے بھی بمشکل واقف ہو سکتے تھے قرآن نے یہ بتایا کہ

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ

(۲/۲۱۳) چونکہ تمام نوعِ انسانی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے اس لئے اس مقصد کے پیشِ نظر کہ ان کے مفاد کے باہمی تصادم سے فساد کی چنگاریاں نہ ابھریں، خدا نے ایسی تعلیم بھیجی جس پر عمل پیرا ہونے سے فساد کا امکان نہ رہے۔
—— چنانچہ اس نے حضرات انبیاءِ کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اس تعلیم کے حامل تھے فرمایا :۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۲)

تمہاری یہ امّت ایک امّتِ واحدہ ہے اور اس کی وجہ جامعیت اس حقیقت پر ایمان کہ ان سب کا پروردگار ایک ہے۔

اس وحدتِ انسانی کی عملی شکل اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو۔ سب انسان خدا کے قانون کے محکوم رہیں۔ یہ تعلیم اپنی آخری شکل میں قرآن کریم کی رُو سے انسانوں تک پہنچی جس کا مقصود تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری تصوّر کر کے جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کی عملی شکل تشکیل کرنا ہے۔ اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی نقطہ کی طرف قدم اٹھاتے ہیں لیکن اس کی تکمیل حجّ کے اجتماع میں ہوتی ہے جو اسلامی نظام کا اہم رکن ہے۔

حجّ سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریقِ رنگ و نسل اور بلا امتیازِ وطن و زبان جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ محکومیّت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے۔ اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیرِ قیادت، مرکزِ وحدتِ انسانیت، یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرائے ملّت اپنے میں سے ایک امیر الامراء کا انتخاب کرلیں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتّب کرلیں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے اور جو امن و سلامتیٔ انسانیّت کا ضامن اور فلاح و سعادتِ آدمیّت کا کفیل ہو۔ ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد تمام نمائندگان

مقامِ منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات اور جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا اثر اور ردِّ عمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی، جس کیلئے "قربانی" تجویز کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام نوعِ انسانی کو ایک امّتِ واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کیلئے بتایا ہے۔ قرآن کریم نے حج کے اس مقصد اور غایت کو دو مقامات پر دو دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ آپ ان مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند، اور کوئی اندازِ بیاں اس سے بھی بلیغ ہو سکتا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ: لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲ : ۲۸) تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں اور اس کی غایت؟ قِيَامًا لِّلنَّاسِ (۵ : ۹۷) یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

غور کیجئے! کیا دنیا میں کسی کانفرنس، کسی اسمبلی، کسی پارلیمنٹ، کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند ہو سکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرفِ انسانیت کے قیام کا باعث ہو۔ کسی خاص قوم، خاص جماعت، خاص ملک، خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے قیام کا باعث! یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد یعنی قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔

کہا جا سکتا ہے کہ آج اقوامِ متحدہ کی مجلس (یو۔این۔او) کے اجتماعات میں تمام دنیا کی قوموں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں اور ان کے سامنے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی رہے۔ پھر یہ اجتماعات اپنے مقصدِ پیشِ نظر میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے اور حج کے اجتماع میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بناء پر وہ اجتماع ایسے بلند اور درخشندہ مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ حج کے اجتماع میں فی الواقعہ ایک خصوصیت ہے۔ ایک بندۂ مومن کے اس عہد و پیمان کی جو وہ اپنے خدا سے باندھتا ہے اور جس کی تجدید حج کا نقطۂ آغاز ہے۔ ایک عبدِ مسلم اپنے خدا سے اقرار کرتا ہے کہ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶ : ۱۶۳) میری صلوٰۃ اور میرے مناسک۔ میرا جینا اور میرا مرنا۔ سب کچھ فقط اللہ کے لئے ہے کسی اور غرض کیلئے نہیں۔ یعنی اس مقصد کے حصول کیلئے جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ یہ ہے وہ اقرار جس کی تجدید اس اجتماعِ عظیم سے پہلے تمام نمائندگان فداکارانہ انداز سے خدا کے گھر یعنی ملّتِ حنیفہ کے مرکزِ محسوس کے گرد گھوم کر کرتے ہیں اور اس طرح زمین و آسمان کو اپنے اس عہد پر گواہ ٹھہراتے ہیں۔ اس نصب العین کو دل میں لئے ہوئے، یہ نمائندگانِ نوعِ انسانی، انسانیت کی فلاح و سعادت کا پروگرام مرتب

کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد باندھتے ہیں۔ یہ ہے وہ خصوصیت جو دنیا میں کسی اور اجتماع کو حاصل نہیں۔ فلہٰذا وہ اجتماعات، بلند آہنگ دعووں کے باوجود انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے نہ آج تک کچھ کر سکے ہیں نہ آئندہ کر سکیں گے۔ پہلی جنگ کے بعد اقوامِ مغرب نے جمیعتہ الاقوام ——LEAGU OF NATIONS کی طرح ڈالی۔ لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں "کفن چوروں" کی یہ جماعت جس بُری طرح ناکام ہوئی۔ واقعات اس پر شاہد ہیں۔ اس کے متعلق (MR. REVES) اپنی کتاب (ANATOMY OF PEACE) میں لکھتا ہے کہ "لیگ آف نیشنز" کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ " دنیا کے مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کر کے باہمی بحث و تمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے،" دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوامِ مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربے کو دہرایا اور سمجھ لیا کہ لیگ آف نیشنز کا نام (UNITED NATIONS ORGANIATION) رکھ دینے سے کامیابی ہو جائے گی۔ یہ جمعیتِ اقوامِ متحدہ کس بُری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ابھی دو ہفتے ہوئے لندن کے اخبار "ڈیلی میل" نے لکھا ہے کہ " جمعیتِ اقوامِ متحدہ اپنی موجودہ ہیئت میں امنِ عالم کے لئے سخت خطرے کا موجب ہے اس لئے اسے فوراً ختم کر دینا چاہیئے اور اس کی وجہ (MR. REEVES) کے الفاظ میں یہ ہے کہ " ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعہ دُور نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوعِ انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت یعنی وہی چیز جسے علامہ اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ :

اِس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ مِلل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم

حج سے مقصود اسی "جمعیّتِ آدم" کی تشکیل تھا۔ اس حج پر نگاہ رکھیے اور پھر اس حج پر جو آج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے ۔ لیکن اس آئینِ کہن میں آج بھی وہی روح پیدا کی جا سکتی ہے جو انسانیّت کے شرف کی کفیل ہے۔ آج عالمِ اسلامی چاروں طرف سے مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشے پر کہیں ان کا نام نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف

قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جارہی ہیں۔ باہمی میل ملاپ کے سلیقے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طریقِ ربط و اخوت کی طرف نہیں اٹھتی جسے ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا، جس سے ہمارے دلوں میں ائتلاف اور نگاہوں میں یک رنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم اسے ایک بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجویز نہیں سوچتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر اقوامِ عالم کی تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے ہماری کامیابیاں انہی کے پیمانوں سے ناپی جائیں گی۔ لیکن جس وقت ہم نے اپنے اللہ سے جھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اس مرکز کو زندہ کر دیا جس کی زندگی سے تمام نوعِ انسانی کی زندگی وابستہ ہے۔ اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصہ میں آجائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے ممبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشتِ حیات سرسبز و شاداب ہوگی۔

آج مسلمانانِ عالم کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

اطلاع

ادارہ طلوعِ اسلام لاہور امسال عید کارڈ
شائع کر رہا ہے
کرمفرما اور بزمیں، اپنی ضروریات سے آگاہ فرمائیں!

ناظم ادارہ

کرنے کا کام

اگر کسی کے دل میں فی الواقعہ پاکستان کا درد ہے اور اس قوم کو تباہی سے بچانے کی تمنا اس کے سینے میں موجزن ہے تو اس کیلئے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ مملکت کو قرآنی اقدار کے تابع لے آئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ یہ مملکت ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو جائے گی بلکہ عزّت و ثروت کے اس مقامِ بلند پر پہنچ جائے گی، جہاں سے انسان اپنے مقدّر کے ستارے جھک کر دیکھا کرتا ہے۔

یاد رکھئے!

اس قوم کو نہ سیاسی مہرہ بازیاں بچا سکتی ہیں نہ آئینی فسوں سازیاں، نہ معاشی شعبدہ کاریاں اسے سنبھالا دے سکتی ہیں نہ انتخابی ابلہ فریبیاں اسے بچا سکتی ہیں، اسے بچا سکتی ہیں صرف مستقل اقدار خداوندی کی جنّت سامانیاں۔ اگر ان سے اعراض برتا گیا تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ یہی خدا کی سنّتِ مستمرہ ہے

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔

اور سُنّت اللہ کبھی بدلا نہیں کرتی۔

یاد رکھیئے!

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

تجارت

تجارت یا خرید و فروخت کا کاروبار بہت بلند پیشہ ہے۔ ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تجارت فرمائی۔ خود اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں سے خرید و فروخت کا معاملہ کر رکھا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ
بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (٩/١١١)

(اللہ نے مومنوں سے جنت کے عوض ان کے جان اور مال خرید لئے ہیں۔)

کہتے ہیں برکت کے سو حصوں میں سے تجارت کو ستر اور باقی سب پیشوں کو تیس ٣٠ حصے ملے ہیں۔ تجارت میں برکت خدمت سے ہے۔ مخلوقِ خدا کی خدمت انسانیت کا جوہر ہے ؎

یہی ہے عبادت یہی دین و ایمان
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انسان

تاجر ضرورت کی چیزیں یہاں وہاں دُور دُور سے مخلوقِ خدا کے لئے جمع کرتا ہے۔ تاجر نہ ہو تو چیزوں کا حاصل کرنا مشکل کیا ناممکن ہو جائے۔ اناج، ترکاریاں، چارہ دُور دراز دیہاتوں میں بسنے والے کسان اگاتے ہیں۔ پھل پھلاری باغبان بہم پہنچاتے ہیں۔ چارہ کی بدولت دودھ، مکھن گوشت مویشیوں سے ملتا ہے۔ خدا جانے یہ دنیا کب سے آباد ہے۔ زمین ہے کہ ساری آبادی کا پیٹ بھرنے کے لئے خوراک ہمیشہ سے برابر اُگل رہی ہے۔ خوراک کے ختم نہ ہونے والے خزانے اللہ تعالیٰ نے زمین میں بھر دیئے ہیں۔ یہی خزانے ہیں جن سے جانداروں کے رزق کا ذمہ جو اللہ نے لیا ہے پورا ہوتا ہے۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (١١/٦)۔

زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہو۔

کھانے پینے کے علاوہ استعمال کی چیزیں بھی اسی زمین کی بدولت میسر ہیں۔ روئی، پٹ سن، گنا، لوہا، تانبا، گیس کی چیزوں کو لوگوں تک پہنچانا دشوار کام ہے۔ تاجر یہ دشوار کام انجام دیتا ہے۔ اسی سے تجارت میں بلندی، اہمیت اور برکت ہے۔

خدمت، تجارت کی جان اور منافع اس کا جسم ہے۔ جسم اور جان (یعنی منافع کی خواہش اور جذبۂ خدمت) میں موافقت سے تاجر کی شان ہے اور منافع کی بے جا ہوس سے بچنا تاجر کے لئے جان جوکھوں کا کام ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ منافع خوری کے مواقع تاجر کے سامنے خود بخود آتے رہتے ہیں۔ خریدار ضرورت سے مجبور ہوتا ہے۔ اس کی مجبوری کا احساس تاجر کو زیادہ قیمت مانگنے پر اکساتا ہے۔ وہ بڑھ چڑھ کر قیمت طلب کرتا ہے۔ خریدار منہ مانگی قیمت ادا کرتا ہے مگر اس سودے میں تجارت کا بنیادی مقصد (یعنی خدمتِ خلق) فوت ہو جاتا ہے۔ منافع کی ہوس پر قابو پانا تاجر کے لئے کٹھن منزل ہے مگر ہمت والے ہر کٹھن منزل کو سر کر لیتے ہیں۔ اس منزل کو سر کرنے کے لئے قرآنِ مجید نے مؤثر ہدایات دی ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۴/۲۹)

ایک دوسرے کا مال دھوکہ اور فریب سے مت کھاؤ بلکہ ایسی تجارت سے حاصل کرو جس میں خریدار اور تاجر دونوں مطمئن ہوں۔ ناحق مال کھا کر لوگوں کو قتل یعنی تباہ و برباد نہ کرو۔

تجارتی حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ گاہک سے اللہ سے مانگنے میں کمی ہرگز مت کرو۔ چیز کی قیمتِ خرید سے گاہک بالعموم ناواقف ہوتا ہے۔ ہوشیار دکاندار گاہک کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی قیمت مانگتا ہے جسے گاہک کی جیب برداشت کر سکے۔ چار روپے کی چیز کے وہ بلا تکلف دس روپے مانگ لے گا۔ گاہک نے بہت ہمت کی تو آٹھ آنے لگا کر چیز خرید لے گا اور دکاندار کو دُگنے دام وصول ہو جائیں گے۔ یہ ہے دوسرے کا مال "بالباطل" کھانے کی مثال۔ اس مثال میں سودا بظاہر گاہک اور دکاندار کی رضامندی یعنی "عن تراض منکم" سے ہوا لیکن یہ رضامندی ناواقفیت اور مجبوری کی رضامندی ہے۔ دل کی رضامندی نہیں ہے۔ کسی کا عزیز تکلیف میں تڑپ رہا ہے۔ دوا صرف چور بازار میں دس گنی قیمت پر مل سکتی ہے۔ دس گنی قیمت دینے پر خریدار مجبور ہے۔ وہ اس پر رضامند ہرگز نہیں ہے گاہک کی ناواقفیت یا مجبوری پر مبنی سودوں کی کثرت ہو جائے تو دیکھنے والی آنکھ کو ہر طرف اقتصادی

تباہی اور بربادی نظر آئے گی۔ اس ہولناک منظر کو قرآنِ مجید نے لوگوں کے قتل سے تعبیر کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سودے بازی میں تاجر کا ہاتھ عموماً اونچا ہوتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ایسے گاہک ناپید ہیں جو تاجر کو جل دینے کی کوشش کرتے ہیں اور بسا اوقات کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ایسے دھوکا باز گاہک " لَا تَاكُلُوْا اموالكم بينكم بالباطل" کے حکم میں اسی طرح آتے ہیں جس طرح بھولے بھالے گاہک کو ہاں کرنے پر مجبور کرنے والا تاجر۔

قرآنِ مجید میں دوسری جگہ ہے۔

اوفو الكيل وَ الميزان بالقسط (۶/۱۵۳)۔

ناپ تول پوری کرو۔

اس طرح کہ گاہک اور دکاندار دونوں کے مفاد سامنے رہیں۔ مزید زور کے لئے فرمایا۔

ويل للمطففين الذين اذا اكتالوا على الناس يستوفون و

اِذا كالوهم او وزنوهم يخسرون۔ (۱-۲/۸۳)۔

تباہی، بربادی اور ہلاکت ہے کمی کرنے والوں کے لئے۔ جو لیتے وقت پوری ماپ لیتے ہیں اور دیتے وقت ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔

تجارت کا کاروبار ناپ تول کا کاروبار ہے۔ اس میں ذرا سا فرق بھی تاجر کی ایمانداری اور بے ایمانی کا پول کھول دیتا ہے۔ ناپ تول میں کمی آسانی سے پکڑی جاتی ہے۔ قرآنی آیات کا منشا یہ ہے کہ تاجر دیانتداری کو ہرگز نہ چھوڑے۔ نہ گاہک کے حق میں کمی کرے نہ اپنے حق میں "بالباطل" اور ڈنڈی مار تجارت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب بہت سے اقوال ہیں۔

● — تمام کمائیوں میں پاک کمائی ان تاجروں کی ہے جو معاملات میں جھوٹ نہ بولیں۔ لین دین میں خیانت نہ کریں۔ وعدہ کریں تو اسے پورا کریں۔ جب کوئی چیز خریدنا چاہیں تو قیمت گرانے کے لئے اس کی برائی نہ کریں۔ اور جب کوئی بیچنا چاہیں تو قیمت بڑھانے یا خریدار کو رغبت دلانے کے لئے اس چیز کی تعریف میں مبالغہ نہ کریں۔ ان پر کسی کا قرض ہو تو ادا کرنے میں سستی اور ٹال مٹول سے کام نہ لیں اور اگر کسی پر ان کا قرض ہو تو تقاضہ میں سخت کلامی اور بے مروتی سے پیش نہ آئیں۔

● — جھوٹ بول کر مال بیچنے والا تاجر اور تجارت میں بے ایمانی کرنے والے دکاندار قیامت کے دن بدترین گنہگاروں کی صف میں ہوں گے۔

● — تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ کلام نہ کرے گا نہ انہیں رحمت کی نظر سے دیکھے گا۔

نہ انہیں گناہوں سے پاک کرے گا بلکہ ان پر عذاب ہوگا۔ ایک تکبر کرنے والا، دوسرا کسی پر احسان کر کے جتانے والا اور تیسرا جھوٹی قسم کھا کر اپنا مال بیچنے والا۔

- جو مال اپنی ملکیت یا قبضہ میں نہ ہو وہ مت بیچو۔
- تجارت کے نفع میں سے کچھ خیرات کر دیا کرو تاکہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور نادانستہ خطاؤں کی تلافی ہوجایا کرے۔
- قسم سے مال کی نکاسی تو ہوتی ہے لیکن مال کی برکت جاتی رہتی ہے۔
- کھیتی کا غلہ یا باغ کی بہار اس وقت تک مت بیچو جب تک وہ پختگی کو نہ پہنچ جائے۔
- جو زمین تم خود کاشت نہ کر و اسے مسلمان بھائی کو کاشت کے لئے دے دو۔ اس سے نہ کرایہ لو نہ بٹائی کا معاملہ کرو۔

تجارت میں جتنی بدعنوانیاں ہوسکتی ہیں آجکل وہ سب بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ہر شے میں ملاوٹ اور چور بازاری ہے۔ قیمتیں آسمان کو جارہی ہیں۔ ناپ تول میں احتیاط مفقود ہے۔ درآمد اور برآمد میں بے ایمانی کی شکایت عام ہے۔ نہ ملکی بدنامی کا خیال ہے نہ قومی ذلت کا احساس۔

تجارت میں بدعنوانیوں کی بنیاد تاجر کی بڑھی ہوئی ہوس منافع خوری ہے۔ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے وہ ہر حربہ کا استعمال صحیح سمجھتا ہے۔ دولت جمع کرنے کا سودا ساری عمر سر میں سمایا رہتا ہے الھکم التکاثر حتی زرتم المقابر (۲-۱۰۲/۱) دولت سمیٹنے کا جنون قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔

منافع خوری کی ہوس پر قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ تاجر کے جائز منافع کا تقرر ہو۔ یہ کام آسان نہیں۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے قرآن مجید نے دو اصول بتائے ہیں۔ ایک اصول یہ ہے کہ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی اور تم پر ظلم کرے۔ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ (۲/۲۷۹) یعنی نہ تم کسی کے حق میں کمی کرو اور نہ کسی اور کو اپنے حق میں کمی کرنے دو۔ اور دوسرا اصول یہ ہے کہ انسان کا حق اتنا ہی ہے جتنا اس نے محنت کر کے حاصل کیا ہو۔ "لیس للانسان الا ما سعی" (۵۳/۳۹)۔

تاجر اپنی محنت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ دکان کا حصول، چیزوں کی فراہمی، فراہم شدہ چیزوں کی حفاظت اور آخر کار ان کی فروخت ایسے امور ہیں جو محنت اور کاوش چاہتے ہیں اور تاجر ان سب سے عہدہ برا ہوتا ہے۔ وہ جسمانی محنت بھی کرتا ہے اور دماغی کاوش بھی۔ یہ دماغی قابلیت ہی ہے جس کی بدولت تاجر کو بسا اوقات بہت سا منافع مل جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سارے منافع کا وہ بلاشرکت غیرے حقدار ہے یا نہیں جہاں تک دماغی قابلیت کا تعلق ہے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ تاجر کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہے۔ وہ پیدائشی ہے اور

قدر کا انعام۔ اس لئے دماغی قابلیت کے ذریعہ جو معاوضہ حاصل ہوتا ہے۔ تاجر اس کا بلا شرکت غیرے حقدار ٹھہر نہیں سکتا۔ اس معاوضہ کو اسے دماغی قابلیت دینے والے کی طرف لوٹانا ہوگا۔ انسانی محنت میں قدرتی اسباب کی اعانت کو جو اہمیت ہے اسے قرآنِ مجید نے سورۂ واقعہ کی آیات ۶۳ تا ۷۲ میں کھیتی، بارش وغیرہ کی مثالوں سے بڑے لطیف انداز سے سمجھایا ہے۔ زمین تیار کر کے تم بیج بوتے ہو، پانی دیتے ہو اور فصل کی رکھوالی کرتے ہو لیکن فصل کی تیاری میں تمہاری کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک آسمان سے پانی نہ برسے اور سورج سے حرارت اور روشنی، اور زمین اور ہوا سے پودوں کو خوراک نہ ملے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ لے لو باقی اسے دو جس نے پانی، حرارت، ہوا اور روشنی مہیا کی۔

تاجر چاہے تو قرآن مجید کے ان اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنا منافع ایسا مقرر کر سکتی ہے جس میں نہ گاہک پر ظلم ہو اور نہ تاجر پر۔

اس کا یہ اقدام پاکستان کی آئیڈیالوجی کے عین مطابق ہوگا۔ خدا کرے کہ ہمارے تاجر قرآنی اصولوں پر کاربند ہو جائیں اور اپنے کاروبار میں وہ طرزِ عمل اختیار کریں جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے بتایا ہے۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (۴۸/۲۹)

اللہ کا فضل اور منافع چاہئیں تو اس کی مرضی کے مطابق یہ اصول اور یہ طرزِ عمل کی وہ بنیاد ہے جس پر قائم ہو کر تجارت کا پیشہ، خریدار، دکاندار، قوم، ملک اور ساری انسانیت کے لئے باعثِ رحمت اور برکت بن سکتا ہے۔

(طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۳ء سے ماخوذ)

اسلام کا نظامِ معاشرت کیا ہے؟
اور وہ کیسے متشکل ہو سکتا ہے؟
اس کا جواب
نظامِ ربوبیت میں ملاحظہ کیجئے۔